مشتاق احمد یوسفی

(کھٹ مِٹھے مضامین)

مشتاق احمد یوسفی

والدِ مرحوم کے نام

ترتیب

پہلا پتھر

مقدمہ نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو۔ اسی لیے بڑے بڑے مصنّف بھاری رقمیں دے کر اپنی کتابوں پر پروفیسروں اور پولیس سے مقدمے لکھواتے اور چلواتے ہیں۔ اور حسبِ منشا بدنامی کے ساتھ بری ہوتے ہیں۔ فاضل مقدمہ نگار کا ایک پیغمبرانہ فرض یہ بھی ہے کہ وہ دلائل و نظائر سے ثابت کر دے کہ اِس کِتاب مستطاب کے طلوع ہونے سے قبل، ادب کا نقشہ مسدس حالی کے عرب جیسا تھا:

"ادب" جس کا چرچا ہے یہ کُچھ وہ کیا تھا

جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا

اس میں شک نہیں کہ کوئی کتاب بغیر مقدمہ کے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل نہیں کر سکتی۔ بلکہ بعض معرکۃ الآراء کتابیں تو سراسر مقدمے ہی کی چاٹ میں لکھی گئی ہیں۔ برنارڈ شا کے ڈرامے (جو در حقیقت اس کے مقدّموں

کی ضمیمے ہیں) اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اور دُور کیوں جائیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جو محض آخر میں دعا مانگنے کے لالچ میں نہ صرف یہ کہ پوری نماز پڑھ لیتے ہیں بلکہ عبادت میں خشوع و خضوع اور گلے میں رُندھی رُندھی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اپنی مالی مشکلات کو حاضر و ناظر جانتے ہیں۔ لیکن چند کتابیں ایسی بھی ہیں جو مقدمہ کو جنم دے کر خود دم توڑ دیتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری، جس کا صرف مقدمہ باقی رہ گیا ہے۔ اور کچھ مصنّف تو ایسے بھی گزرے ہیں جو مقدمہ لکھ کر قلم توڑ دیتے ہیں۔ اور اصل کتاب کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ جیسے شعر و شاعری پر مولانا حالی کا بھرپور مقدمہ جس کے بعد کسی شعر و شاعری کی تاب و تمنّا ہی نہ رہی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ، اس کتاب میں سے مقدمہ نکال دیا جائے تو صرف سرورق باقی رہ جاتا ہے۔

تاہم اپنا مقدمہ بقلم خود لکھنا کارِ ثواب ہے کہ اس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ آدمی کتاب پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے ورنہ ہمارے نقّاد عام طور سے کسی تحریر کو اس وقت تک غور سے نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر سرقہ کا شبہ نہ ہو۔

پھر اس بہانے اپنے چند ایسے نجی سوالات کا دندان شکن جواب دیا جا سکتا ہے جو ہمارے ہاں صرف چالان اور چہلم کے موقع پر پوچھے جاتے ہیں۔ مثلاً کیا تاریخ

پیدائش وہی ہے جو میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج ہے؟ حلیہ کیا ہے؟ مرحوم نے اپنے "بینک بیلنس" کے لیے کتنی بیویاں چھوڑی ہیں؟ بزرگ افغانستان کے راستے سے شجرۂ نسب میں کب داخل ہوئے؟ نیز موصوف اپنے خاندان سے شرماتے ہیں یا خاندان ان سے شرماتا ہے؟ راوی نے کہیں آزاد کی طرح جوشِ عقیدت میں ممدوح کے جدِّ امجد کے کانپتے ہُوئے ہاتھ سے اُسترا چھین کر تلوار تو نہیں تھمادی؟

چنانچہ اس موقع سے جائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا مختصر ساخاکہ پیش کرتا ہوں:

نام: سرورق پر ملاحظہ فرمایئے

خاندان: سوپشت سے پیشہ آباء سپہ گری کے سوا سب کچھ رہا ہے۔

تاریخِ پیدائش: عمر کی اس منزل پر آپہنچا ہوں کہ اگر کوئی سن ولادت پوچھ بیٹھے تو اسے فون نمبر بتا کر باتوں میں لگالیتا ہوں۔

اور یہ منزل بھی عجیب ہے۔ بقول صاحب "کشکول" ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف بہو بیٹی قسم کی خواتین سے اس طرح کرایا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ فلاں کے بھانجے ہیں اور اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں اور فلاں کے

ماموں۔ عمر رسیدہ پیش رو زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس کے آگے مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں۔

پیشہ: گو کہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اوّل آیا، لیکن اسکول میں حساب سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ اور حساب میں فیل ہونے کو ایک عرصے تک اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتا رہا۔ اب وہی ذریعہ معاش ہے۔ حساب کتاب میں اصولاً دو اور دو چار کا قائل ہوں۔ مگر تاجروں کی دل سے عزت کرتا ہوں کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے دو اور دو کو پانچ کر لیتے ہیں۔

پہچان : قد: پانچ فٹ ساڑھے چھ انچ (جوتے پہن کر)

وزن: اوور کوٹ پہن کر بھی دُبلا دکھائی دیتا ہوں۔ عرصے سے مثالی صحت رکھتا ہوں۔ اس لحاظ سے کہ جب لوگوں کو کراچی کی آب و ہوا کو برا ثابت کرنا مقصود ہو تو اتمام حجت کے لیے میری مثال دیتے ہیں۔

جسامت: یوں سانس روک لوں تو ۳۸ انچ کی بنیان بھی پہن سکتا ہوں۔ بڑے لڑکے کے جوتے کا نمبر ۷ ہے، جو میرے بھی فِٹ آتا ہے۔

حلیہ: اپنے آپ پر پڑا ہوں۔

پیشانی اور سر کی حدِّ فاصل اڑ چکی ہے۔ لہٰذا منہ دھوتے وقت یہ سمجھ نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ناک میں بذات کوئی نقص نہیں مگر دوستوں کا خیال ہے کہ بہت چھوٹے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔

پسند: غالب، ہاکس بے، بھنڈی

پھولوں میں، رنگ کے لحاظ سے سفید گلاب اور خوشبوؤں میں نئے کرنسی نوٹ کی خوشبو بہت مرغوب ہے۔ میرا خیال ہے کہ سر سبز تازہ تازہ اور کرارے کرنسی نوٹ کا عطر نکال کر ملازمت پیشہ حضرات اور ان کی بیویوں کو مہینے کی آخری تاریخوں میں سنگھایا جائے تو گرہسی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے۔

پالتو جانوروں میں کتّوں سے پیار ہے۔ پہلا کتّا چوکیداری کے لیے پالا تھا۔ اُسے کوئی چُرا کر لے گیا۔ اب بر بنائے وضع داری پالتا ہوں کہ انسان کتّے کا بہترین رفیق ہے۔ بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان کتّوں سے بلا وجہ چڑتے ہیں حالانکہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں۔ وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔

گانے سے بھی عشق ہے۔ اسی وجہ سے ریڈیو نہیں سنتا۔

چِڑ: جذباتی مرد، غیر جذباتی عورتیں، مٹھاس، شطرنج۔

مشاغل: فوٹو گرافی، لکھنا پڑھنا

تصانیف: چند تصویر ان بتاں، چند مضامین و خطوط

کیوں لکھتا ہوں: ڈزریلی نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جب میرا جی عمدہ تحریر پڑھنے کو چاہتا ہے تو ایک کِتاب لکھ ڈالتا ہوں۔ رہا سوال کہ یہ کھٹ مٹھے مضامین طنزیہ ہیں یا مزاحیہ یا اس سے بھی ایک قدم آگے۔۔۔ یعنی صرف مضامین، تو یہاں صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ وار ذرا اوچھا پڑے، یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ مزاح

ہاتھ آئے تو بت، نہ آئے تو خدا ہے

اور یہاں یہ صورت ہو تو خام فن کار کے لیے طنز ایک مقدس جھنجلاہٹ کا اظہار بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ لکھنے والا جو سماجی اور معاشی ناہمواریوں کو دیکھتے ہی دماغی باؤٹے میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، خود کو طنز نِگار کہنے اور کہلانے کا سزاوار سمجھتا ہے۔ لیکن سادہ و پُرکار طنز ہے بڑی جان جوکھوں کا کام۔ بڑے

بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسّے پر اِترا اِترا کر کرتب نہیں دِکھاتے بلکہ "رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر۔"

اور اگر ژاں پال سارتر کی مانند "دماغ روشن و دل تِیرہ و نگہ بے باک" ہو تو جنم جنم کی یہ جھنجلاہٹ آخر کار ہر بڑی چیز کو چھوٹی کر کے دکھانے کا ہنر بن جاتی ہے۔ لیکن یہی زہرِ غم جب رگ و پے میں سرایت کر کے لہو کو کچھ اور تیز و تند و توانا کر دے تو نَس نَس سے مزاح کے شرارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ عملِ مزاح اپنے لہو کی آگ میں تَپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے۔ اور کوئلہ راکھ۔ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا، ہیرا بن جاتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ ننّھے سے چراغ سے کوئی الاؤ بھڑک سکا اور نہ کوئی چِتا دہکی۔

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اپنی چاک دامنی پر جب اور جہاں ہنسنے کو جی چاہا ہنس دیا۔ اور اب اگر آپ کو بھی اس ہنسی میں شامل کر لیا تو اس کو اپنی خوش قسمتی تصور کروں گا۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہنسنے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ پھر اتنے بُرے نہیں معلوم ہوتے۔ بالفعل، اس سے بھی غرض نہیں کہ اس خندہ مکرّر سے میرے سوا کسی اور کی اصلاح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔

ہنسنے کی آزادی فی نفسہ تقریر کی آزادی سے کہیں زیادہ مقدم و مقدس ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو قوم اپنے آپ پر جی کھول کر ہنس سکتی ہے وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتی۔

یقین کیجئے، اس سے اپنے علاوہ کسی اور کی اصلاح و فہمائش مقصود ہو تو روسیاہ۔ کارلائل نے دوسروں کی اصلاح سے غلو رکھنے والوں کو بہت اچھی نصیحت کی تھی کہ "بڑا کام یہ ہے کہ آدمی اپنی ہی اصلاح کر لے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دنیا سے کم از کم ایک بدمعاش تو کم ہوا۔" میری رائے میں (جو ضروری نہیں کہ ناقص ہی ہو) جس شخص کو پہلا پتھّر پھینکتے وقت اپنا سر یاد نہیں رہتا، اسے دوسروں پر پتھّر پھینکنے کا حق نہیں۔

مخدومی و مکرمی جناب شاہد احمد دہلوی کا تہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے یہ مضامین، جو اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے، پڑھوا کر بکمال توجہ سنے۔ اور نہ صرف اپنی گھمبیر چپ سے کمزور حصّوں کی نشاندہی کی، بلکہ جو لطیفے بطورِ خاص پسند آئے ان پر گھر جا کر بہ نظر حوصلہ افزائی ہنسے بھی۔ اگر اس کے باوجود وہ زبان و بیان کی لغزشوں سے پاک نہیں ہوئے (اشارہ مضامین کی طرف ہے) تو اس میں ان کا قصور نہیں۔ یوں بھی میں قبلہ شاہد احمد صاحب کی با

وقار سنجیدگی کا اس درجہ احترام کرتا ہوں کہ جب وہ اپنا لطیفہ سُنا چکتے ہیں تو احتراماً نہیں ہنستا۔ لیکن ایک دن یہ دیکھ کر میرا ایک مضمون پڑھ کے "الٹی ہنسی" (جس میں، بقول اُن کے، آواز حلق سے باہر نکلنے کی بجائے اُلٹی اندر جاتی ہے) ہنس رہے ہیں، میں خوشی سے پھُولا نہ سمایا۔

پوچھا: "دلچسپ ہے؟"

فرمایا: "جی! تذکیر و تانیث پر ہنس رہا ہوں!"

پھر کہنے لگے: "حضرت! آپ پنگ پانگ کو مؤنث اور فٹ بال کو مذکّر لکھتے ہیں!"

میں نے کھسیانے ہو کر جھَٹ اپنی پنسل سے فٹ بال کو مؤنث اور پنگ پانگ کو مذکّر بنا دیا تو منہ پھیر پھیر کر "سیدھی" ہنسی ہنسنے لگے۔

دوستوں کا حساب گو دِل میں ہوتا ہے، لیکن رسماً بھی اپنی اہلیہ ادریس فاطمہ کا شکریہ ضروری ہے کہ

"خطا" شناس من است و منم زباں و دانش

ان مضامین میں جو غلطیاں آپ کو نظر آئیں، اور وہ جو اب بھی نظر آ رہی ہیں، ان کا سہرا بالترتیب ان کے اور میرے سر ہے۔ اس سے پہلے وہ میرے مطبوعہ

مضامین میں کتابت کی غلطیاں کچھ اس انداز سے نکالتی تھیں گویا لیتھو مَیں نے ہی ایجاد کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس کتاب کو آفسٹ پر چھپوانے میں مکتبہ جدید کی ترغیب و تحریص سے زیادہ ان کے طعن و تعریض کو دخل ہے۔ رُخصت ہونے سے قبل مرزا عبدالودود بیگ کا تعارف کراتا جاؤں۔ یہ میرا ہم زاد ہے۔ دُعا ہے خدا اس کی عمر و اقبال میں ترقّی دے۔

کراچی

۵ فروری ۱۹۶۱ء

مشتاق احمد

یوسفی

پس لفظ: ان مضامین اور خاکوں کو پڑھ کر اگر کوئی صاحب نہ مُسکرائیں تو ان کے حق میں یہ فال نیک ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود مزاح نگار ہیں۔

م۔ا۔ی

پڑیئے گر بیمار

تو کوئی نہ ہو تیمار دار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیمار دار نہ ہو تو بیمار پڑنے سے فائدہ؟ اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو؟ توبہ کیجیئے! مرنے کا یہ اَکل کھُرا دقیانوسی انداز مجھے کبھی پسند نہ آیا۔ ہو سکتا ہے غالب کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے، مرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ اور سچ پوچھئے تو مرنے کا سلیقہ کچھ مشرق ہی کا حصّہ ہے۔ اسی بنا پر غالب کی نفاست پسند طبیعت نے ۱۹۷۷ء میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا کہ اس میں ان کی کسرِ شان تھی۔ حالانکہ اپنی پیشن گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کے آرزومند تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باعزّت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہنر ہے جس کے لیے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے۔ اور اللہ اگر توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ بالخصوص پیشہ ور سیاستدان اس کے فنّی آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ بہت کم لیڈر ایسے گزرے ہیں جنہیں صحیح وقت پر مرنے کی

سعادت نصیب ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہر لیڈر کی زندگی میں، خواہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ ذرا جی کڑا کر کے مر جائے یا اپنے سیاسی دُشمنوں کو رشوت دے کر اپنے آپ کو شہید کرا لے تو وہ لوگ سال کے سال نہ سہی، ہر الیکشن پر ضرور دھُوم دھَام سے اس کا عُرس منایا کریں۔ البتہ دقّت یہ ہے کہ اس قسم کی سعادت دوسرے کے زورِ بازو پر منحصر ہے۔ اور سعدی کہہ گئے ہیں کہ دوسرے کے بل بوتے پر جنت میں جانا عقوبتِ دوزخ کے برابر ہے۔ پھر اس کا کیا علاج کہ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ورنہ سرِ دست مجھے ان خوش نصیب جواں مرگوں سے سروکار نہیں جو جینے کے قرینے اور مرنے کے آداب سے واقف نہیں۔ میرا تعلق تو اس مظلوم اکثریت سے ہے جس کو بقول شاعر:

جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

چنانچہ اس وقت میں اس بے زبان طبقہ کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں، جو اس درمیانی کیفیت سے گزر رہا ہے جو موت اور زندگی دونوں سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔ یعنی بیماری! میرا اشارہ اس طبقہ کی طرف ہے جسے سب کچھ اللہ نے

دے رکھا ہے، صحت کے سوا۔ میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمۂ علالت ہے۔ اسپرین کی صرف ایک گولی یا مارفیا کا ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔ ایک دائم المرض کی حیثیت سے جو اس دردِ لا دوا کی لذّت سے آشنا ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مارفیا کے انجکشن مریض کے بجائے مزاج پُرسی کرنے والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔

اُردُو شاعری کے بیان کو باور کیا جائے تو پچھلے زمانے میں علالت کی غایت "تقریب بہر ملاقات" کے سوا کچھ نہ تھی۔ محبوب عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا اور ہر سمجھ دار آدمی اسی امید میں بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پُرسی کو آنکلے۔

علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اس زمانے کے اندازِ عیادت میں کوئی دِل نوازی ہو تو ہو، میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں۔ ایک حساس دائم المرض کے لیے "مزاج اچھا ہے؟" ایک رسمی یا دعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی

حملہ ہے جو ہر بار اُسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں تو آئے دن کی پرسشِ حال سے اس قدر بے زار ہو چکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کر دیا ہے کہ جب تک میں بقلم خود یہ اطلاع نہ دوں کہ آج اچھا ہوں۔ مجھے حسبِ معمول بیمار ہی سمجھیں اور مزاج پرسی کر کے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیں۔

سُنا ہے کہ شائستہ آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ دوا نہ بتائے۔ شائستگی کا یہ سخت معیار تسلیم کر لیا جائے تو ہمارے ملک میں سوائے ڈاکٹروں کے کوئی اللہ کا بندہ شائستہ کہلانے کا مستحق نہ نکلے۔ یقین نہ آئے تو جھوٹ موٹ کسی سے کہہ دیجئے گا کہ مجھے زکام ہو گیا ہے۔ پھر دیکھئے، کیسے کیسے مجرب نسخے، خاندانی چُٹکلے اور فقیری ٹوٹکے آپ کو بتائے جاتے ہیں۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی اصل وجہ طبّی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاقِ سلیم کی کمی۔ بہرحال بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرست آدمی اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فی صد لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟

بعض اوقات احباب اس بات سے بہت آزردہ ہوتے ہیں کہ میں ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا۔ حالانکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو۔ اس وقت میرا منشا صلاح و مشورہ کے نقصانات گنوانا نہیں (اس لیے کہ میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے۔ اسی سے ذہنی توازن قائم رہتا ہے) نہ یہاں ستم ہائے عزیزاں کا شکوہ مقصود ہے۔ مدعا صرف اپنے ان بہی خواہوں کو متعارف کرانا ہے جو میرے مُزمِن امراض کے اسباب و علل پر غور کرتے اور اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً مجھے مستفید فرماتے رہتے ہیں۔ اگر اس غول میں آپ کو کچھ جانی پہنچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجئے، آپ خود لائقِ ہمدردی ہیں۔

سرِ فہرست اُن مزاج پُرسی کرنے والوں کے نام ہیں جو مرض کی تشخیص کرتے ہیں، نہ دوا تجویز کرتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منکسر مزاج ہیں۔ دراصل ان کا تعلق اس مدرسۂ فِکر سے ہے جس کے نزدیک پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ یہ اس شکم آزار عقیدے کے مبلغ و موید ہیں کہ کھانا جتنا پھیکا سیٹھا ہو گا، صحت کے لیے اتنا ہی مفید ہو گا۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہو گا کہ ہمارے ملک

میں دواؤں کے خواص دریافت کرنے کا بھی یہی معیار ہے۔ جس جس طرح بعض خوش اعتقاد لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر بدصورت عورت نیک چلن ہوتی ہے، اسی طرح طبِ قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مُصفّیٔ خُون تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے قدحے اِسی اُمید میں نوشِ جان کیے جاتے ہیں۔

اس قبیل کے ہمدردانِ صحت دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک وہ غذا رسیدہ بزرگ جو کھانے سے علاج کرتے ہیں۔ دوسرے جو علاج اور کھانے دونوں سے پرہیز تجویز فرماتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں گوہانجنی نِکلی تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں، چھوٹتے ہی بولے:

"فمِّ معدہ پر وَرم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھایئے۔ دافع نفخ و محلّلِ وَرم ہے۔"

میں نے پوچھا "آخر آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہنچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں؟"

فرمایا "کیا مطلب؟"

عرض کیا "دو چار دن مونگ کی دال کھالیتا ہوں تو اُردُو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشا تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس صورت میں خدانخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کے کیا کروں گا؟"

بولے "آپ تجارت کو اِتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اُس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازو تھی۔"

گزارش کی "اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی!"

بات انہیں بہت بری لگی۔ اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ سچ تھی۔ اس کے بعد تعلّقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ استعارہ و کنایہ برطرف، میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جب تک آدمی کو خواص کی غذا مِلتی رہے، اُسے غذا کے خواص کے بکھیڑے میں پڑنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ سچ پوچھیئے تو عمدہ غذا کے بعد کم از کم مجھے تو بڑا اِنشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کر ہر راہ گیر کو سینے سے لگا لوں۔ دوسرا گردہ قوّتِ ارادی سے دوا اور غذا کا کام لینا چاہتا ہے اور جسمانی عوارض کے علاج معالجہ سے پہلے دماغ کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ حضرات ابتدائے مرض ہی

سے دوا کے بجائے دُعا کے قائل ہیں اور ان میں بھاری اکثریت اُن سٹّرے بہتّرے بزرگوں کی ہے جو گھگیا گھگیا کر اپنی درازئ عمر کی دُعا مانگتے ہیں اور اسی کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس روحانی غذا کے لیے میں فی الحال اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ مجھے اس پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصّہ اِس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہو جاتے ہیں۔

کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے اندازِ پرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی آسمانی ہدایت کے بموجب اس کی تفتیش پر مامور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحبِ فراش ہو گیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے، کمرۂ علالت میں بہ نفسِ نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا مُنہ میرے کان کے قریب لا کر رازدارانہ انداز میں کچھ ایسے نجی سوالات کیے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں بیوی اور منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔

ایک بزرگوار ہیں جن سے صرف دورانِ علالت میں ملاقات ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ موصوف آتے ہی برس پڑتے اور گرجتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کا ذکر ہے۔ ہلہلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ آدھمکے۔ کپکپا کر کہنے لگے: "بیماری آزاری میں بھی بڑی غیریت برتتے ہو، برخوردار! دو گھنٹے سے ملیریا میں چُپ چاپ مبتلا ہو اور مُجھے خبر تک نہ کی۔"

بہترا چاہا کہ اِس دفعہ اُن سے پوچھ ہی لوں کہ "قبلہ کونین! اگر آپ کو بروقت اطلاع کرا دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے؟"

ان کی زبان اُس قینچی کی طرح ہے جو چلتی زیادہ ہے اور کاٹتی کم۔ ڈانٹنے کا انداز ایسا ہے کہ جیسے کوئی کودن لڑکا زور زور سے پہاڑے یاد کر رہا ہو۔ مجھے اُن کی ڈانٹ پر ذرا غصّہ نہیں آتا۔ کیونکہ اب اس کا مضمون ازبر ہو گیا ہے۔ یوں بھی اس کینڈے کے بزرگوں کی نصیحت میں سے ڈانٹ اور ڈاڑھی کو علیٰحدہ کر دیا جائے، یا بصورتِ نقصِ امن، ڈانٹ میں سے ڈنک نکال دیا جائے تو بقیہ بات (اگر کوئی چیز باقی رہتی ہے) نہایت لغو معلوم ہو گی۔

ان کا آنا فرشتۂ موت کا آنا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السّلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔ زکام انہیں

نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا ہے اور خسرہ میں ٹائیفائڈ کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام چل سکتا ہے، وہاں بے دھڑک بگل بجا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک ہی سانس میں خدانخواستہ سے انّا لِلّٰہ تک کی تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ اُن کی مظلوم ڈانٹ کی تمہید کچھ اس قسم کی ہوتی ہے:

"میاں! یہ بھی کوئی انداز ہے کہ گھر کے رئیسوں کی طرح نبض پر ہاتھ دھرے منتظرِ فرواہو۔ بیکاری بیماری کا گھر ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

بیمار مباش کچھ کیا کر"

مصرع کا جواب شعر سے دیتا ہوں:

کمزور میری صحت بھی، کمزور مری بیماری بھی

اچھا جو ہوا کچھ کر نہ سکا، بیمار ہُوا تو مر نہ سکا

یہ سُن کر وہ بپھر جاتے ہیں اور اپنے سن و سال کی آڑ لے کر کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان میں وہ بے نقط سناتے ہیں کہ زندہ تو در کنار، مردہ بھی ایک دفعہ کفن پھاڑ کر سوال و جواب کے لیے اُٹھ بیٹھے۔ تقریر کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ راقم

الحروف جان بوجھ کر اپنی تندرستی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر خودکُشی میرا منشا ہوتا تو یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں جیتا، بلکہ آنکھ بند کر کے اُن کی تجویز کردہ دوائیں کھا لیتا۔

آیئے، ایک اور مہربان سے آپ کو ملواؤں۔ اُن کی تکنیک قدرے مختلف ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی ایسے ہراساں ہوتے ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کا معمول ہے کہ کمرے میں بغیر کھٹکھٹائے داخل ہوتے ہیں اور میرے سلام کا جواب دیئے بغیر تیمار داروں کے پاس پنجوں کے بل جاتے ہیں۔ پھر کھُسر پھُسر ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی اُچٹتا ہوا فقرہ مجھے بھی سنائی دے جاتا ہے۔ مثلاً:

"صدقہ دیجئے۔ جمعرات کی رات بھاری ہوتی ہے۔"

"پانی حلق سے اُتر جاتا ہے؟"

"آدمی پہچان لیتے ہیں؟"

یقین جانیے۔ یہ سُن کر پانی سر سے گزر جاتا ہے اور میں تو رہا ایک طرف، خود تیمار دار میری صورت نہیں پہچان سکتے۔

سرگوشیوں کے دوران ایک دو دفعہ میں نے خُود دخل دے کر بقائمی ہوش و حواس عرض کرنا چاہا کہ میں بفضلِ تعالیٰ چاق و چوبند ہوں۔ صرف پیچیدہ دواؤں میں مُبتلا ہوں۔ مگر وہ اس مسئلہ کو قابلِ دست اندازیٔ مریض نہیں سمجھتے اور اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے اعلانِ صحت اور اُن کی پُر زور تردید سے تیمار داروں کی میری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوں بھی بخار سو ڈگری سے اوپر ہو جائے تو میں ہذیان بکنے لگتا ہوں، جسے بیگم، اقبالِ گناہ اور رشتے دار وصیت سمجھ کر ڈانٹتے ہیں اور بچے ڈانٹ سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا یہ حضرت مزاج پرسی کرنے آتے ہیں یا پرسا دینے۔ ان کے جانے کے بعد میں واقعی محسوس کرتا ہوں کہ بس اب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ سانس لیتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ روایتی ہچکی نہ آ جائے۔ ذرا گرمی لگتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید آخری پسینہ ہے اور طبیعت تھوڑی بحال ہوتی ہے تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں کہ کہیں سنبھالا نہ ہو۔

لیکن مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نِرالا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں ان کے فلسفۂ حیات و ممات ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ تندرستی وبال معلوم ہوتی ہے اور غُسلِ صحت میں وہ تمام قباحتیں نظر آتی ہیں، جن سے غالب کو فکرِ وصال میں دوچار ہونا پڑا کہ:

گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

اکثر فرماتے ہیں کہ بیماری جان کا صدقہ ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ میرے حق میں تو یہ صدقۂ جاریہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے خالی بیمار پڑ جانے سے کام نہیں چلتا۔ اس لیے کہ پسماندہ ممالک میں فیضانِ علالت عام سہی، عرفانِ علالت عام نہیں۔

ایک دن میں کان کے درد میں تڑپ رہا تھا کہ وہ آ نکلے۔ اس افراتفری کے زمانے میں زندہ رہنے کے شدائد اور موت کے فیوض و برکات پر ایسی مؤثر تقریر کی کہ بے اختیار جی چاہا کہ انہی کے قدموں پر پھڑ پھڑا کر اپنی جان آفرین کے سپرد کر دوں اور انشورنس کمپنی والوں کو روتا دھوتا چھوڑ جاؤں۔ ان کے دیکھے سے میرے تیمار داروں کی منہ کی رہی سہی رونق جاتی رہتی ہے۔ مگر میں سچے دل سے ان کی عزت کرتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ محض جینے کے لیے کسی فلسفہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جان دینے پر آمادہ کرنے کے لیے سلیقہ چاہیے۔

چونکہ یہ موقع ذاتی تاثرات کے اظہار نہیں۔ اس لیے میں مرزا کے اندازِ عیادت کی طرف لوٹتا ہوں۔ وہ جب تندرستی کو اُمّ الخبائث اور تمام جرائم کی جڑ

قرار دیتے ہیں تو مجھے رہ رہ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقّی یافتہ ممالک میں تندرستی کی وبا عام ہے وہاں پر جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ میں کان کے درد سے نڈھال ہونے لگا تو انہوں نے مسئلہ مسائل بیان کر کے میری ڈھارس بندھائی:

"میاں ہمت سے کام لو۔ بڑے بڑے نبیوں پر یہ وقت پڑا ہے۔"

میں درد سے ہلکان ہو چکا تھا۔ ورنہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ خدا مارے یا چھوڑے، میں بغیر دعویٰ نبوّت یہ عذاب جھیلنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ علاوہ ازیں، قصص الانبیاء میں نے بچپن میں پڑھی تھی اور یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ کون سے پیغمبر کان کے درد کے باوجود فرائض نبوی انجام دیتے رہے۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد میں نے ازراہِ تفنّن مرزا سے کہا "فیرینک ہیرس کے زمانے میں کوئی صاحبِ استطاعت مرد اس وقت تک 'جنٹلمین' ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا جب تک وہ کم از کم ایک مرتبہ ناگفتہ بہ جنس امراض میں مبتلا نہ ہوا ہو۔ یہ خیال عام تھا کہ اس سے شخصیت میں لوچ اور رچاؤ پیدا ہوتا ہے۔"

تمباکو کے پان کا پہلا گھونٹ پی کر کہنے لگے "خیر! یہ تو ایک اخلاقی کمزوری کی فلسفیانہ تاویل ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ درد اخلاق کو سنوارتا ہے۔"

وہ ٹھیرے ایک جھکی۔ اس لیے میں نے فوراً یہ اقرار کر کے اپنا پنڈ چھڑایا کہ "مجھے اس کلیہ سے اتفاق ہے۔ بشرطیکہ درد شدید ہو اور کسی دوسرے کے اُٹھ رہا ہو۔"

پچھلے جاڑوں کا ذکر ہے۔ میں گرم پانی کی بوتل سے سینک کر رہا تھا کہ ایک بزرگ جو اسّی کے پیٹے میں ہیں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک قبر و عاقبت کی باتیں کرتے رہے جو میرے تیمار داروں کو ذرا قبل از وقت معلوم ہوئیں۔ آتے ہی بہت سی دعائیں دیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا مجھے ہزاری عُمر دے تا کہ اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لئے زندہ رہوں۔ اس کے بعد جانکنی اور فشارِ گور کا اس قدر مفصّل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گورِ غریباں کا گمان ہونے لگا۔ عیادت میں عبادت کا ثواب لوٹ چکے تو میری جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور رعشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین ماہ قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں میں مبتلا تھا) یاد کر کے کچھ اس طرح آب دیدہ ہوئے کہ میری بھی ہچکی بندھ

گئی۔ میرے لئے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انہیں کچھ قرار آیا تو وہ مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر حسرت کا اظہار کیا گیا ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے۔

میں فطرتاً رقیق القلب واقع ہوا ہوں اور طبیعت میں ایسی باتوں کی سہار بالکل نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد "جب لاد چلے گا بنجارا" والا موڈ طاری ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر پرچھائیں بھوت اور ہر سفید چیز فرشتہ دکھائی دیتی ہے۔ ذرا آنکھ لگتی ہے تو بے ربط خواب دیکھنے لگتا ہوں۔ گویا کوئی "کالک" یا باتصویر نفسیاتی افسانہ سامنے کھلا ہوا ہے:

کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر میری لاش پر انجکشن کی پچکاریوں سے لڑ رہے ہیں اور لہو لہان ہو رہے ہیں۔ اِدھر کچھ مریض اپنی اپنی نرس کو کلوروفام سنگھا رہے ہیں۔ ذرا دور ایک لاعلاج مریض اپنے ڈاکٹر کو یاسین حفظ کرا رہا ہے۔ ہر طرف ساگو دانے اور مونگ کی دال کی کھچڑی کے ڈھیر لگے ہیں۔ آسمان بنفشی ہو رہا ہے اور عناب کے درختوں کی چھاؤں میں، سنا کی جھاڑیوں کی اوٹ لے کر بہت سے غلمان ایک مولوی کو غذا بالجبر کے طور پر معجونین کِھلا رہے ہیں۔ تا حدِّ نظر کافور میں بسے ہوئے کفن ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ جا بجا لوبان سُلگ رہا ہے اور میرا سَر

سنگِ مَر مَر کی لوحِ مزار کے نیچے دبا ہوا ہے اور اس کی ٹھنڈک نَس نَس میں گھسی جا رہی ہے۔ میرے منہ میں سگرٹ اور ڈاکٹر کے منہ میں تھرمامیٹر ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر پر برف کی تھیلی رکھی ہے۔ میرے منہ میں تھرمامیٹر ٹھنسا ہوا ہے اور ڈاکٹر کے ہونٹوں میں سگرٹ دبا ہے۔

لگے ہاتھوں، عیادت کرنے والوں کی ایک اور قسم کا تعارف کرا دوں۔ یہ حضرات جدید طریق کار برتتے اور نفسیات کا ہر اصول داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتے ہیں کہ افاقہ ہوا یا نہیں؟ گویا مریض سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ عالمِ نزع میں بھی ان کی معلومات عامہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے Running Commentary کرتا رہے گا۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کس طرح مریض پر ثابت کر دیں کہ محض انتظاماً بیمار ہے یا وہم میں مبتلا ہے اور کسی سنگین غلط فہمی کی بنا پر اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ان کی مثال اس روزہ خور کی سی ہے جو انتہائی نیک نیتی سے کسی روزہ دار کا روزہ لطیفوں سے بہلانا چاہتا ہو۔ مکالمہ نمونہ ملاحظہ ہو:

ملاقاتی: ماشاءاللہ! آج منہ پر بڑی رونق ہے۔

مریض: جی ہاں! آج شیو نہیں کیا ہے۔

ملاقاتی: آواز میں بھی کرارا پن ہے۔

مریض کی بیوی: ڈاکٹر نے صبح سے ساگو دانہ بھی بند کر دیا ہے۔

ملاقاتی: (اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر) بیگما! یہ صحت یاب ہو جائیں تو ذرا انہیں میری پتھری دکھانا جو تم نے چار سال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے (مریض سے مخاطب ہو کر) صاحب! یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تِنکا بھی شہتیر معلوم ہوتا ہے۔ مگر یقین جانیے، آپ کا شگاف تو بس دو تین انگل لمبا ہو گا، میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کنکھجورا معلوم ہوتا ہے۔

مریض: (کراہتے ہوئے) مگر میں ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوں۔

ملاقاتی: (ایکاایکی پینترا بدل کر) یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو صرف ملیریا ہے۔

مریض: یہ پاس والی چارپائی، جو اب خالی پڑی ہے، اس کا مریض بھی اسی وہم میں مبتلا تھا۔

ملاقاتی:	ارے صاحب! مانئیے تو! آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اُٹھ کر مُنہ ہاتھ دھویئے۔

مریض کی بیوی: (روہانسی ہو کر) دو دفعہ دُھو چکے ہیں۔ صورت ہی ایسی ہے۔

اس وقت ایک دیرینہ کرم فرما یاد آرہے ہیں، جن کا طرزِ عیادت ہی اور ہے۔ ایسا حلیہ بنا کر آتے ہیں کہ خود اُن کی عیادت فرض ہو جاتی ہے۔ "مزاج شریف!" کو وہ رسمی فقرہ نہیں، بلکہ سالانہ امتحان کا سوال سمجھتے ہیں اور سچ مچ اپنے مزاج کی جملہ تفصیلات بتانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دن مُنہ کا مزہ بدلنے کی خاطر میں نے "مزاج شریف!" کے بجائے "سب خیریت ہے؟" سے پرسش احوال کی۔ پلٹ کر بولے "اس جہانِ شَریت میں خیریت کہاں؟" اس مابعد الطبیعاتی تمہید کے بعد کراچی کے موسم کی خرابی کا ذکر آنکھوں میں آنسو بھر کر ایسے انداز سے کیا گویا ان پر سراسر ذاتی ظلم ہو رہا ہے، اور اس کی تمام تر ذمّہ داری میونسپل کارپوریشن پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض عورتیں شاعر کی نصیحت کے مطابق وقت کو پیمانۂ اِمروز و فَردا سے نہیں ناپتیں بلکہ تاریخ و سنہ اور واقعات کا حساب اپنی یاد گار زچگیوں سے لگاتی ہیں۔ مذکور الصّدر دوست بھی اپنی بیماریوں سے کیلنڈر کا کام

لیتے ہیں۔ مثلاً شہزادی مارگریٹ کی عمر وہ اپنے دَمے کے برابر بتاتے ہیں۔ سوئز سے انگریزوں کے نہر بدر کیے جانے کی تاریخ وہی ہے جو اُن کا پِتّا نکالے جانے کی! میرا قاعدہ ہے کہ جب وہ اپنی اور جملہ متعلقین کی عدم خیریت کی تفصیلات بتا کر اُٹھنے لگتے تو اطلاعاً اپنی خیریت سے آگاہ کر دیتا ہوں۔

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں۔ مگر ایک فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ اس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہو جاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسیلی باتیں جو عام طور پر ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتی ہیں، بے شمار دِل آزار فقرے جو "خوفِ فسادِ خلق" سے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں، اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں "ہوالشّافی" کہہ کر بڑی بے تکلّفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سنیچر کی بات ہے۔ میری عقل ڈاڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک روٹھے ہوئے عزیز جِن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپیہ سے چھت پڑی تھی، لقا کبوتر کی مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے:

"ہیں آپ بھی ضدّی آدمی! لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنوا لیجیے، مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔"

طعنے کی کاٹ درد کی شدّت پر غالب آئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، "بھائی! میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی۔ خُدارا! آپ ہی بتایئے، کیا یہ تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے؟"

ہنس کر فرمایا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کرائے کے مکان میں تندرستی کیوں کر ٹھیک رہ سکتی ہے۔"

کچھ دن بعد جب انہی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو بے اختیار ان کا سر پیٹنے کو جی چاہا۔

اب کچھ جگ بیتی بھی سُن لیجیے۔ جھوٹ سچ کا حال خدا جانے۔ لیکن ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو ماہ قبل اُن کے گلے میں خراش ہو گئی، جو ان کے نزدیک بدمزہ کھانے اور گھر والوں کے خیال میں سگرٹ کی زیادتی کا نتیجہ تھی۔ شروع میں تو انہیں اپنی بیٹھی ہوئی آواز بہت بھلی معلوم ہوئی اور کیوں نہ ہوتی؟ سُنتے چلے آئے ہیں کہ بیٹھی ہوئی (Husky) آواز میں بے پناہ جِنسی کشش ہوتی ہے۔ خدا کی دین تھی کہ گھر بیٹھے آواز بیٹھ گئی۔ ورنہ امریکہ میں تو لوگ کوکا کولا کی طرح ڈالر بہاتے ہیں جب کہیں آواز میں یہ مستقل زُکام کی سی کیفیت پیدا

ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ذرا افاقہ محسوس ہوا تو انہوں نے راتوں کو گڑ گڑا گڑ گڑا کر، بلکہ خُنخنا خُنخنا کر دعائیں مانگیں:

"بارِ الہٰا! تیری شانِ کریمی کے صدقے! یہ سوزش بھلے ہی کم ہو جائے، مگر بھراہٹ یونہی قائم رہے!"

لیکن چند دن بعد جب ان کا گلا خالی نَل کی طرح بھَق بھَق کرنے لگا تو انہیں بھی تشویش ہوئی۔ کسی نے کہا "لقمان کا قول ہے کہ پانی پیتے وقت ایک ہاتھ سے ناک بند کر لینے سے گلا کبھی خراب نہیں ہوتا۔"

ایک صاحب نے ارشاد فرمایا "سارا فتور پھل نہ کھانے کے سبب ہے۔ میں تو روزانہ نہار منہ پندرہ فٹ گنا کھاتا ہوں۔ معدہ اور دانت دونوں صاف رہتے ہیں۔" اور ثبوت میں انہوں نے اپنے مصنوعی دانت دکھائے جو واقعی بہت صاف تھے۔

ایک اور خیر خواہ نے اطلاع دی کہ زکام ایک زہریلے وائرس Virus سے ہوتا ہے جو کسی دوا سے نہیں مرتا۔ لہٰذا جوشاندہ پیجئے کہ انسان کے علاوہ کوئی جاندار اس کا ذائقہ چکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

بقیہ روداد انہی کی زبان سے سنئے:

"اور جن کرم فرماؤں نے ازراہِ کسرِ نفسی دوائیں تجویز نہیں کیں۔ وہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام اور پتے بتا کر اپنے فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔ کسی نے اِصرار کیا کہ 'آیورویدک' علاج کراو۔ بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ میں طبعی موت مرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ 'حکیم نباضِ مِلّت سے رجوع کیجئے۔ نبض پر اُنگلی رکھتے ہی مریض کا شجرۂ نسب بتا دیتے ہیں (اِسی وجہ سے کراچی میں اُن کی طبابت ٹھَپ ہے) قارورے پر نظر ڈالتے ہی مریض کی آمدنی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔' آواز اگر ساتھ دیتی تو میں ضرور عرض کرتا کہ ایسے کام کے آدمی کو تو انکم ٹیکس کے محکمہ میں ہونا چاہیے۔"

غرضیکہ جتنے منہ ان سے کہیں زیادہ باتیں! اور تو اور سامنے کے فلیٹ میں رہنے والی اسٹینو گرافر (جو چُست سُویٹر اور جینز پہن کر، بقول مرزا عبد الودود بیگ، انگریزی کا S معلوم ہوتی ہے) بھی مزاج پُرسی کو آئی اور کہنے لگی "حکیموں کے چکر میں نہ پڑیئے۔ آنکھ بند کر کے ڈاکٹر دلاور کے پاس جایئے۔ تین مہینے ہوئے، آواز بنانے کی خاطر میں نے اِملی کھا کھا کر گلے کا ناس مار لیا تھا۔ میری خوش نصیبی کہئے کہ ایک سہیلی نے اُن کا پتہ بتا دیا۔ اب بہت افاقہ ہے۔"

"اس بیان کی تائید کچھ دِن بعد مرزا عبدالودود بیگ نے بھی کی۔ انہوں نے تصدیق کی ڈاکٹر صاحب امریکی طریقہ سے علاج کرتے ہیں اور ہر کیس کو بڑی توجّہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ سینڈل کے علاوہ ہر چیز اُتروا کر انہوں نے اسٹینو گرافر کے حلق کا بغور معائنہ کیا۔ علاج سے واقعی کافی افاقہ ہوا اور وہ اس سلسلے میں ابھی تک پیٹھ پر بنفشی شعاعوں سے سینک کرانے جاتی ہے۔"

مجھے یقین ہے کہ اس طریقہ علاج سے ڈاکٹر موصوف کو کافی افاقہ ہوا ہو گا!

کافی

میں نے سوال کیا "آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا "آپ کیوں نہیں پیتے؟"

"مجھے اس میں سِگار کی سی بو آتی ہے۔"

"اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوتِ شامہ کی کوتاہی ہے۔"

گو کہ ان کا اشارہ صریحاً میری ناک کی طرف تھا، تاہم رفعِ شر کی خاطر میں نے کہا "تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے واقعی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تاکہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔"

تڑپ کر بولے "صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا، تا وقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفّظ کی مجبوری نہ ہو۔ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دُھنگارے ہوئے رائتہ میں ہوتا ہے۔"

میں نے معذرت کی "کھُرچن اور دُھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔"

فرمایا "تعجب ہے! یو۔پی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔"

"میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔"

چراندے ہو کر کہنے لگے "آپ قائل ہو جاتے ہیں تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔"

جواباً عرض کیا "گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے۔ لہٰذا ہم اپنی اصل رائے کا اظہار صرف نشہ اور غصّہ کے عالم میں کرتے ہیں۔ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا، لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچّے کو پِلا کر اس کی صورت دیکھ لیجیے۔"

جھلا کر بولے "آپ بحث میں معصوم بچّوں کو کیوں گھسیٹتے ہیں؟"

میں بھی الجھ گیا" آپ ہمیشہ 'بچّوں' سے پہلے لفظ 'معصوم' کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ بچّے گناہگار بھی ہوتے ہیں؟ خیر، آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بِلّی کو لیجیے۔"

"بِلّی ہی کیوں؟ بکری کیوں نہیں؟" وہ سچ مُچ مچلنے لگے۔

میں نے سمجھایا" بِلّی اس لئے کہ جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، بچے اور بِلّیاں بُرے بھلے کی کہیں بہتر تمیز رکھتے ہیں۔"

ارشاد ہوا" کل کو آپ یہ کہیں گے کہ چونکہ بچّوں اور بلّیوں کو پکّے گانے پسند نہیں آسکتے اس لیے وہ بھی لغو ہیں۔"

میں نے انہیں یقین دلایا" میں ہر گز یہ نہیں کہہ سکتا۔ پکّے راگ انہیں کی ایجاد ہیں۔ آپ نے بچّوں کا رونا اور بلّیوں کا لڑنا۔۔۔۔۔"

بات کاٹ کر بولے" بہر حال ثقافتی مسائل کے حل کا نتیجہ ہم بچّوں اور بِلّیاں پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصوابِ رائے کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا

جواب دینے کی بجائے اُلٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسارِ رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوبصورت عورت کی عمر دریافت کرنا (اس کا مطلب یہ نہیں کہ نیک مرد کی عمر اور خوبصورت عورت کی آمدنی دریافت کرنا خطرے سے خالی ہے)۔ زندگی میں صرف ایک شخص ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ اِلتفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔

ایک صاحب تو اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہہ کر چپ ہو گئے کہ

چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

میں نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے "دراصل یہ عادت کی بات ہے۔ یہ کمبخت کافی بھی روائتی چنے اور ڈومنی کی طرح ایک دفعہ منہ سے لگنے کے بعد چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ ہے ناں؟"

اس مقام پر مجھے اپنی معذوری کا اعتراف کرنا پڑا کہ بچپن ہی سے میری صحت خراب اور صحبت اچھی رہی۔ اس لئے ان دونوں خوب صورت بلاؤں سے محفوظ رہا۔

بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ایمان کی بات ہے کہ چھوٹے الزام کو سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے مگر سچّے الزام سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سُننا پڑتی ہیں، ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک کرم فرمانے میری بیزاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا:

ہائے کمبخت تونے پی ہی نہیں

ان کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کافی سے چِڑ کی اصل وجہ معدے کے وہ داغ (Ulcers) تو نہیں جن کو میں دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھے ہیں۔

اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگے۔

استصوابِ رائے عامہ کا حشر تو آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے (یا محض عادت ہی ڈال لے) تو ہر بُری چیز

میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نِکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقّہ ہی کو لیجیے۔ معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حقّہ پینے سے تفکّرات پاس نہیں پھٹکتے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اگر تمبا کو خراب ہو تو تفکّرات ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خورد و نوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ آجانے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزہ دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤزبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفسِ امّارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلجم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے۔ لیکن جدید طبّی ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہلِ ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

معلوم نہیں کہ کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انہیں ذرا بھی علم ہوتا تو چرائتہ کی طرح یہ بھی یونانی طب کا جزوِ اعظم ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے "اللہ شافی اللہ کافی" کہہ کر مؤخر الذّکر کا

سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس قسم کی جڑی بوٹیوں کا استعمال عداوت اور عقدِ ثانی کے لیے مخصوص تھا۔ چونکہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے، اس لیے صرف اظہارِ خلوصِ باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے کہ چائے کے باغات بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہیں ملتی بلکہ غلہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلوماتِ عامہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اُگتی ہو گی۔ کیونکہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشمِ تخیل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہو سکتی ہے۔ اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اُگتا ہو گا؟ ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنہیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھئے تو مجھے اپنا ملک اسی لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

میں مشروبات کا پارکھ نہیں ہوں۔ لہٰذا مشروب کے اچھے یا بُرے ہونے کا اندازہ ان اثرات سے لگاتا ہوں جو اسے پینے کے بعد رونما ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں نے کافی کو شراب سے بدرجہا بدتر پایا۔ میں نے دیکھا ہے کہ شراب پی کر سنجیدہ حضرات بے حد غیر سنجیدہ گفتگو کرنے لگتے ہیں جو بے حد جاندار ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کافی پی کر غیر سنجیدہ لوگ انتہائی سنجیدہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے سنجیدگی سے چِڑ نہیں بلکہ عشق ہے۔ اسی لیے میں سنجیدہ آدمی کی مسخرگی برداشت کرلیتا ہوں، مگر مسخرے کی سنجیدگی کا روادار نہیں۔ شراب کے نشے میں لوگ بلا وجہ جھوٹ نہیں بولتے۔ کافی پی کر لوگ بلا وجہ سچ نہیں بولتے۔ شراب پی کر آدمی اپنا غم اوروں کو دے دیتا ہے مگر کافی پینے والے اوروں کے فرضی غم اپنا لیتے ہیں۔ کافی پی کر حلیف بھی حریف بن جاتے ہیں۔

یہاں مجھے کافی سے اپنی بیزاری کا اظہار مقصود ہے۔ لیکن اگر کسی صاحب کو یہ سطور شراب کا اشتہار معلوم ہوں تو اسے زبان و بیان کا عجز تصور فرمائیں۔ کافی کے طرفدار اکثر یہ کہتے ہیں کہ یہ بے نشے کی پیالی ہے۔ بالفرضِ محال یہ گزارشِ احوال واقعی یا دعویٰ ہے تو مجھے ان سے دلی ہمدردی ہے۔ مگر اتنے کم داموں میں آخر وہ اور کیا چاہتے ہیں؟

کافی ہاؤس کی شام کا کیا کہنا! فضا میں ہر طرف ذہنی کہرا چھایا ہوا ہے۔ جس کو سرمایہ دار طبقہ اور طلبا سرخ سویرا سمجھ کر ڈرتے اور ڈراتے ہیں۔ شور و شغب کا یہ عالم کہ اپنی آواز تک نہیں سنائی دیتی اور بار بار دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں نے کیا کہا۔ ہر میز پر تشنگانِ علم کافی پی رہے ہیں۔ اور غروبِ آفتاب سے غرارے تک، یا عوام اور آم کے خواص پر بقراطی لہجے میں بحث کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کافی اپنا رنگ لاتی ہے اور تمام بنی نوعِ انسان کو ایک برادری سمجھنے والے تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کی ولدیت کے بارے میں اپنے شکوک کا سلیس اُردُو میں اظہار کرنے لگتے ہیں، جس سے بیروں کو کلیتہً اتفاق ہوتا ہے۔ لوگ روٹھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ گھر جائیں گے

گھر میں بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلکچوئل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں بھی اس رائے سے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منہ نہیں بند رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط

نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے۔ جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ کافی نہایت مفرّح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے یہ مثال دی کہ "ابھی کل ہی کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر بے حد نڈھال پہنچا۔ بیگم بڑی مزاج ہیں۔ فوراً کافی کا TEA POT لا کر سامنے رکھ دیا۔"

میں ذرا چکرایا "پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں نے دودھ دان سے کریم نکالی" انہوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا "شکر دان سے کیا نکلا؟"

فرمایا "شکر نکلی، اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟"

مجھے غصّہ تو بہت آیا مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق یہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا

ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پر تکلّف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظر حوصلہ افزائی اس کو معزّز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب دریافت پوچھی۔

حبشی نے جواب دیا ”بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں۔ پھر اس میں کافی مِلا کر دم کرتا ہوں۔“

”لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو۔ بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔“

”حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟“ آقا نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

خانساماں سہم گیا ”نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔“

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تُندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں اور قوتِ برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی گولیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا!

لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے زہر کی تاب نہیں لا سکتی۔ لیکن دقّت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلّف پر محمول کرتے ہیں۔

لہٰذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں:

"ایک چمچہ یا دو؟"

تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ میرے لیے شکر دان میں کافی کے دو چمچ ڈال دیجیے۔

صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورد و نوش کا تعلق ہے، میں تہذیب حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کی بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبّت ہو جاتی ہے، اس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی

لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کُن ہوتا ہے۔ بد ذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا اپِتّا مارنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلہ میں برسوں تلخی کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں، تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی کی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔ بنابریں، میں ہر کافی پینے والے کو جنّتی سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے، ان پر دوزخ اور حمیم حرام ہیں۔

کافی امریکہ کا قومی مشروب ہے۔ میں اب بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا، یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔ یہ بعینہ ایسا سوال ہے جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ "غبارِ خاطر" چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے "غبارِ خاطر" کے باعث؟ ایک صاحب نے مجھے لاجواب کرنے کی خاطر یہ دلیل پیش کی امریکہ میں تو کافی اس قدر عام ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے۔ عرض کیا کہ جب خود قیدی اس پر احتجاج نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی کہ وکالت کریں۔ پاکستانی جیلوں میں بھی قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جائے تو انسدادِ جرائم میں کافی مدد ملے گی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ وہاں لاعلاج مریضوں کو بشاش رکھنے کی غرض سے کافی پلائی جاتی ہے۔ کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کیا کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دمِ نزع حلق میں پانی چوانے کی بجائے

کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیے جائیں تو مریض کا دم آسانی سے نکل جائے۔ بخدا، مجھے تو اس تجویز پر بھی کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ گناہ گاروں کی فاتحہ کافی پر دلائی جائے۔

سنا ہے کہ بعض رواداار افریقی قبائل کھانے کے معاملے میں جانور اور انسان کے گوشت کو مساوی درجہ دیتے تھے۔ لیکن جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، ہم نے ان کے بارے میں کوئی بری بات نہیں سنی۔ مگر ہم تو چینیوں کی رچی ہوئی، حسِ شامہ کی داد دیتے ہیں کہ نہ منگول حکمرانوں کا جبر و تشدّد انہیں پنیر کھانے پر مجبور کر سکا، نہ امریکہ انہیں کافی پینے پر آمادہ کر سکا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان کی نفاست نے سخت قحط کے زمانے میں بھی فاقے اور اپنے فلسفے کو پنیر اور کافی پر ترجیح دی۔

ہمارا منشا امریکی یا چینی عادات پر نکتہ چینی نہیں۔ ہر آزاد قوم کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنے منہ اور معدے کے ساتھ جیسا سلوک چاہے، بے روک ٹوک کرے۔ اس کے علاوہ جب دوسری قومیں ہماری رساول، نہاری اور فالودے کا مذاق نہیں اڑاتیں تو ہم دخل درما کولات کرنے والے کون؟ بات دراصل یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں پیاس بجھانے کے لیے پانی کے علاوہ ہر رقیق شئے استعمال

ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ جرمنی (جہاں قومی مشروب بیئر ہے) ڈاکٹر بدرجۂ مجبوری بہت ہی تندرست و توانا افراد کو خالص پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن جِن کو آب نوشی کا چسکا لگ جاتا ہے، وہ راتوں کو چھپ چھپ کر پانی پیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ پیرس کے کیفوں میں رنگین مزاج فن کار بورژوا طبقہ کو چڑانے کی غرض سے کھلم کھلا پانی پیا کرتے تھے۔

مشرقی اور مغربی مشروبات کا موازنہ کرنے سے پہلے یہ بنیادی اصول ذہن نشین کر لینا از بس ضروری ہے کہ ہمارے یہاں پینے کی چیزوں میں کھانے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اپنے قدیم مشروبات مثلاً یخنی، ستّو اور فالودے پر نظر ڈالئے تو یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ستّو اور فالودے کو خالصتاً لغوی معنوں میں آپ نہ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں۔ بلکہ اگر دنیا میں کوئی ایسی شئے ہے جسے آپ با محاورہ اُردُو میں بیک وقت کھا اور پی سکتے ہیں تو یہی ستّو اور فالودہ ہے جو ٹھوس غذا اور ٹھنڈے شربت کے درمیان ناقابلِ بیان سمجھوتہ ہے، لیکن آج کل ان مشروبات کا استعمال خاص خاص تقریبوں میں ہی کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اب ہم نے عداوت نکالنے کا ایک اور مہذب طریقہ اختیار کیا ہے۔

آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ نہ پیدا ہو گیا ہو کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرف دار ہے تو مضمون ختم کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ازبس ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کافی سے اس لیے بیزار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس

ایک وہ ہیں کہ جنہیں چائے کے ارماں ہوں گے

یادش بخیر [1]

یادش بخیر! مجھے وہ شام کبھی نہ بھولے گی جب آخر کار آغا تلمیذ الرّحمٰن چاکسوی سے تعارف ہوا۔ سنتے چلے آئے تھے کہ آغا اپنے بچپن کے ساتھیوں کے علاوہ، جو اب ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گِنے جاسکتے تھے، کسی سے نہیں ملتے اور جس سہمے سہمے انداز سے انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا، بلکہ کرایا، اُس سے بھی یہی ہویدا تھا کہ ہر نئے ملاقاتی سے ہاتھ ملانے کے بعد وہ اپنی انگلیاں ضرور گِن لیتے ہوں گے۔ دشمنوں نے اُڑا رکھی تھی کہ آغا جن لوگوں سے ملنے کے متمنّی رہے ان تک رسائی نہ ہوئی اور جو لوگ ان سے ملنے کے خواہش مند تھے، اُن کو مُنہ لگانا انہوں نے کسرِ شان سمجھا۔ انہوں نے اپنی ذات ہی کو انجمن خیال کیا، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مستقل اپنی ہی صحبت نے اُن کو خراب کر دیا۔ لیکن وہ خُود اپنی کم آمیزی کی توجیہہ یوں کرتے تھے کہ جب پُرانی دوستیاں نبھانے کی توفیق اور

[1] (NOSTALGIA) کا ترجمہ (بروزن مالیخولیا۔ ہسٹیریا)

فُرصت میسر نہیں تو نئے لوگوں سے مِلنے سے فائدہ؟ رہے پُرانے دوست، سو اُن سے بھی ملنے میں زیادہ لُطف، عافیت محسُوس کرتے۔ اس لیے کہ وہ نفسیات کے کِسی فارمولے کی گمراہ کُن روشنی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مِل کے بچھڑنے میں جو دُکھ ہوتا ہے، وہ ذرا دیر مِل بیٹھنے کی وقتی خوشی سے سات گنا شدید اور دیرپا ہوتا ہے اور بیٹھے بٹھائے اپنے دکھوں میں اضافہ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ سُنا یہ ہے کہ وہ اپنے بعض دوستوں کو محض اس بنا پر محبوب رکھتے تھے کہ وہ ان سے پہلے مر چکے تھے اور از بسکہ ان سے ملاقات کا امکان مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا تھا، لہٰذا ان کی یادوں کو حنوط کر کے انہوں نے اپنے دل کے ممّی خانے میں بڑے قرینے سے سجار کھا تھا۔

لوگوں نے اتنا ڈرار کھا تھا کہ میں جھجکتا ہُوا آغا کے کمرے میں داخل ہُوا۔ یہ ایک چھوٹا سا نیم تاریک کمرہ تھا جس کے دروازے کی تنگی سے معاً خیال گزرا کہ غالباً پہلے موروثی مسہری اور دُوسری بھاری بھرکم چیزیں خوب ٹھسا ٹھس جما دی گئیں، اس کے بعد دیواریں اٹھائی گئی ہوں گی۔ میں نے کمال احتیاط سے اپنے آپ کو ایک کونے میں پارک کر کے کمرے کا جائزہ لیا۔ سامنے دیوار پر آغا کی رُبع صدی پُرانی تصویر آویزاں تھی۔ جس میں سیاہ گاؤن پہنے، ڈگری ہاتھ میں لیے، یونیورسٹی پر مُسکرا رہے تھے۔ اس کے عین مقابل، دروازے کے اُوپر دادا

جان کے وقتوں کی ایک کاواک گھڑی ٹنگی ہُوئی تھی جو چوبیس گھنٹے میں صرف دو دفعہ صحیح وقت بتاتی تھی۔ (یہ پندرہ سال سے سوا دو بجا رہی تھی) آغا کہتے تھے کہ اِس گئی گزری حالت میں بھی یہ ان "ماڈرن" گھڑیوں سے بدرجہا بہتر ہے جو چلتی تو چوبیس گھنٹے ہیں مگر ایک دفعہ بھی ٹھیک وقت نہیں بتاتیں۔ جب دیکھو ایک منٹ آگے ہوں گی یا ایک منٹ پیچھے۔

دائیں جانب ایک طاقچے میں جو فرش کی بہ نسبت چھت سے زیادہ نزدیک تھا، ایک گراموفون رکھا تھا، جس کی بالا نشینی پڑوس میں بچوں کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی، ٹھیک اس کے نیچے چیڑ کا ایک لنگڑا اسٹول پڑا تھا، جس پر چڑھ کر آغا چابی دیتے اور چھپّن چھُری اور بھائی چھیلا پٹیالے والے کے گھسے گھسائے ریکارڈ سنتے (سُننے میں کانوں سے زیادہ حافظے سے کام لیتے تھے) اس سے ذرا ہٹ کر برتنوں کی الماری تھی جس میں کتابیں بھری پڑی تھیں ان کے محتاط انتخاب سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُردُو میں جو کچھ لکھا جانا تھا وہ پچیس سال قبل لکھا جا چکا ہے۔ (اُسی زمانے میں سُنا تھا کہ آغا جدید شاعری سے اِس حد تک بے زار ہیں کہ نئے شاعروں کو ریڈیو سیٹ پر بھی ہُوٹ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اکثر فرماتے تھے کہ ان کی جوان رگوں میں روشنائی دوڑ رہی ہے) آتش دان پر سیاہ فریم جڑا ہُوا الوداعی سپاس نامہ رکھا تھا جو اُن کے ماتحتوں نے پندرہ سال قبل پُرانی دِلّی سے

نئ دِلّی تبادلہ ہونے پر پیش کیا تھا۔ اسی تقریب میں یادگار کے طور پر آغا نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ گروپ فوٹو بھی کھنچوایا جس میں آغا کے علاوہ ہر شخص نہایت مطمئن و مسرور نظر آتا تھا۔ یہ پائنتی ٹنگا تھا تاکہ رات کو سونے سے پہلے اور صُبح اُٹھنے کے بعد آئینہ ایام میں اپنی اداد یکھ سکیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت آغا تین درویش صُورت بزرگوں کے حلقے میں مہابلی اکبر کے دور کی خوبیاں اور برکتیں نہایت وارفتگی سے بیان کر رہے تھی۔ گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ابو الفضل کے قتل تک پہنچتے تو ایسی ہچکی بندھی کہ معلوم ہوتا تھا انہیں اس واردات کی اطّلاع ابھی ابھی ملی ہی۔ اس حرکت پر وہ شیخو کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں پہلا درویش بول اُٹھا: ”اماں چھوڑو بھی۔ بھلاوہ بھی کوئی زمانہ تھا۔ جب لوگ چار گھنٹے فی میل کی رفتار سے سفر کرتے تھے۔ اور رؤسا تک جمعہ کے جمعہ نہاتے تھے۔“ اس کا مُنہ آغا نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ حضرت اُس سُنہری زمانے میں ایسی سڑی گرمی کہاں پڑتی تھی؟ پھر پروفیسر شکلا نے آغا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہُوئے ارشاد فرمایا کہ ہمارے سَمے میں بھی بھارت درش کی برکھارُت بڑی ہی سُندر ہوتی تھی (مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے سَمے سے انکی مراد ہمیشہ چندرگُپت موریہ کا عہد ہوتا تھا جس پر وہ تین دفعہ ”تھیسس“ لکھ کر نامنظور کرواچکے تھے) اس مقام

پر چگی ڈاڑھی والا درویش ایکا ایکی او چھا وار کر گیا۔ بولا "آغا! تم اپنے وقت سے ساڑھے تین سو برس بعد پیدا ہوئے ہو۔" اس پر آغا، شکلا جی کی طرف آنکھ مار کر کہنے لگے کہ "تمھارے حساب سے یہ غریب تو پُورے دو ہزار سال لیٹ ہو گیا۔ مگر میں تم سے ایک بات پُوچھتا ہوں۔ کہ کیا تم اپنے تئیں قبل از وقت پیدا ہونے والوں میں شمار کرتے ہو؟ کیا سمجھے؟"

شکلا جی شرماتے لجاتے پھر بیچ میں کُود پڑے "اگر تمہارا مطلب وہی ہے جو میں سمجھا ہُوں تو بڑی ویسی بات ہے۔"

یہ نوک جھونک چل رہی تھی کہ پہلا درویش پھر گھمبیر لہجے میں بولا "قاعدہ ہے کہ کوئی دور اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ آج آپ اکبرِ اعظم کے دور کو یاد کر کے روتے ہیں۔ لیکن یقین ہے کہ اگر آپ اکبر کے عہد میں پیدا ہوتے تو علاؤالدین خلجی کے وقتوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہوتے۔ اپنے عہد سے غیر مطمئن ہونا بجائے خود ترقّی کی نشانی ہے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ حکومتوں کے علاوہ کوئی بھی اپنی موجودہ ترقّی سے مطمئن نہیں ہوتا"

چگی ڈاڑھی والے درویش نے کہا۔

میں نے پہلے درویش کو سہارا دیا "آپ بجا فرماتے ہیں۔ اِسی بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے سے سو فیصد مطمئن ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ گھر انا روبۂ زوال ہے۔ بر خلاف اس کے، اگر کوئی بیٹا اپنے باپ کو دوستوں سے ملانے سے شرمانے لگے تو یہ علامت ہے اِس بات کی کہ خاندان آگے بڑھ رہا ہے۔"

"مگر اس کو کیا کیجئے کہ آج کل کے نوجوان مطلب کی خاطر باپ کو بھی باپ ہی مان لیتے ہیں! کیا سمجھے؟" آغا نے کہا۔

سب کو بڑا تعجب ہوا کہ آغا پہلی ملاقات میں مُجھ سے بے تکلّف ہو گئے---اتنے کہ دوسری صُحبت میں انہوں نے مجھے نہ صرف اپنا پہلونٹی کا شعر بڑے لحن سے سُنایا بلکہ مجھ سے اپنے وہ اداریے بھی پڑھوا کر سُنے جو سترہ اٹھارہ سال پہلے اُنہوں نے اپنے ماہ نامے "سُرودِ رفتہ" میں پُرانی نسل کے بارے میں مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع کیے تھے:

"قارئین کا اڈیٹر کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔"

یہ ربط ضبط دن بدن بڑھتا گیا۔ میں اس تقرّبِ خاص پر نازاں تھا گو کہ حاسدوں کو اور خود مجھے بھی اپنی سیرت میں بظاہر کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی تھی جو آغا

کی پسندیدگی کا باعث ہو۔ خیر ایک روز اُنھوں نے خود یہ عقدہ حل کر دیا۔ فرمایا تمھاری صورت عین مین ہمارے ایک ماموں سے مِلتی ہے جو میٹرک کا نتیجہ نکلتے ہی ایسے روپوش ہُوئے کہ آج تک مفقود الخبر ہیں۔

انگریزوں کا وطیرہ ہے کہ وہ کسی عمارت کو اس وقت تک خاطر میں نہیں لاتے جب تک وہ کھنڈر نہ ہو جائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بعض محتاط حضرات کسی کے حق میں کلمۂ خیر کہنا روا نہیں سمجھتے تاوقتیکہ ممدوح کا چہلم نہ ہو جائے۔ آغا کو بھی ماضی بعید سے، خواہ اپنا ہو یا پرایا، والہانہ وابستگی تھی۔ جس کا ایک ثبوت ان کی ۱۹۲۷ء ماڈل کی فورڈ کار تھی جو انہوں نے ۱۹۵۵ء میں ایک ضعیف العمر پارسی سے تقریباً مفت لی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چلتی بھی تھی اور وہ بھی اِس میانہ روی کے ساتھ محلّے کے لونڈے ٹھلوے جب اور جہاں چاہتے چلتی گاڑی میں کُود کر بیٹھ جاتے۔ آغا نے کبھی تعرض نہیں کیا۔ کیونکہ اگلے چوراہے پر جب یہ دھکڑ دھکڑ کر کے دم توڑ دیتی تو یہی سواریاں دھکّے لگا لگا کر منزلِ مقصُود تک پہنچا آتیں۔ اس صورت میں پٹرول کی بچت تو خیر تھی ہی، لیکن بڑا فائدہ یہ تھا کہ انجن بند ہو جانے کے سبب کار زیادہ تیز چلتی تھی۔ واقعی اس کار کا چلنا اور چلانا معجزۂ فن سے کم نہ تھا اس لیے کہ اس میں پٹرول سے زیادہ خون جلتا تھا۔ آغا دل ہی دِل میں کُڑھتے اور اپنے مصنوعی دانت پیس کر رہ جاتے۔ لیکن

کوئی یہ کار ہدیتاً لینے کے لیے بھی رضامند نہ ہوتا۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہُوا کہ تنگ آ کر آغا کار کو شہر سے دُور کسی پیپل کے نیچے کھڑا کر کے راتوں رات بھاگ آئے۔ لیکن ہر مرتبہ پولیس نے کار سرکاری خرچ پر ٹھیل ٹھال کر آغا کے گھر بحفاظت تمام پُہنچادی۔

غرضیکہ، اس کار کو علیٰحدہ کرنا اِتناہی دُشوار نِکلا جتنا اس کو رکھنا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اِس سے بہت تاریخی حادثوں کی یادیں وابستہ تھیں جن میں آغا بے عزّتی سے بری ہُوئے تھے۔ انجام کار، ایک سُہانی صبح فورڈ کمپنی والوں نے اُن کو پیغام بھیجا کہ یہ کار ہمیں لوٹادو۔ ہم اس کو پبلسٹی کے لیے اپنے قدیم ماڈلوں کے میوزیم میں رکھیں گے اور اس کے بدلے سالِ رواں کے ماڈل کی بڑی کار تمہیں پیش کریں گے۔ شہر کے ہر کافی ہاؤس میں آغا کی خوش نصیبی اور کمپنی کی فیاضی کے چرچے ہونے لگے۔ اور یہ چرچے اُس وقت ختم ہُوئے جب آغا نے اس پیش کش کو حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا۔

کہنے لگے ”دولوں گا!“

کمپنی خاموش ہو گئی اور آغا مُدّ توں اُس کے مقامی کارندوں کی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی پر افسوس کرتے رہے۔ کہتے تھے "لالچی کہیں کے! پانچ سال بعد تین دینی پڑیں گی! دیکھ لینا!"

وہ خلوصِ نیت سے اس دور کو کلجگ کہتے اور سمجھتے تھے۔ جہاں کوئی نئ چیز، کوئی نئ صُورت نظر پڑی اور اُنہوں کچ کچا کے آنکھیں بند کیں اور یادِ رفتگان کے اتھاہ سمندر میں غڑاپ سے غوطہ لگایا۔ اور کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کندھے پر ایک آدھ لاش لادے بر آمد نہ ہُوئے ہوں۔ کہیں کوئی بات بارِ خاطر ہُوئی اور اُنہوں نے "یادش بخیر" کہہ کر بیٹے سَمے اور بچھڑی ہُوئی صُورتوں کی تصویر کھینچ کے رکھ دی۔ ذرا کوئی امریکی طور طریق یا وضع قطع ناگوار گزری اور اُنہوں نے کولمبس کو گالیاں دینی شروع کیں۔ وہ فی الواقع محسوس کرتے کہ ان کے لڑکپن میں گنّے زیادہ میٹھے اور ملائم ہوا کرتے تھے۔ میرے سامنے بارہا اتنی سی بات منوانے کے لیے مرنے مارنے پر تُل گئے کہ اُن کے بچپنے میں چنے ہر گز اتنے سخت نہیں ہوتے تھے۔ کہتے تھے آپ نہ مانیں، یہ اور بات ہے، مگر ٹھوس حقیقت ہے کہ گزشتہ پندرہ بیس سال میں قطب مینار کی سیڑھیاں گھِسنے کی بجائے اور زیادہ اُونچی ہو گئی ہیں۔ اور اس کے ثبوت میں اپنے حالیہ سفر دہلی کا تجربہ ہانپ ہانپ کر بیان کرتے۔ چونکہ ہم میں کسی کے پاس پاسپورٹ تک نہ تھا،

اس لیے اس منزل پر بحث کا پلّہ ہمیشہ اُن کے حق میں جھک جاتا۔ من جملہ دیگر عقائد کے، اُن کا ایمان تھا کہ بکری کا گوشت اب اِتنا حلوان نہیں ہوتا جتنا ان کے وقتوں میں ہُوا کرتا تھا۔ ممکن ہے اس میں کچھ حقیقت بھی ہو مگر وہ ایک لمحے کو یہ سوچنے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس میں دانتوں کا قصُور یا آنتوں کا فتور بھی ہو سکتا ہے۔ وُہ ریشے دار گوشت کو قصائی کی بے ایمانی سے زیادہ بکری کی اپنی بد اعمالیوں سے منسوب کرتے۔ چنانچہ بعض اوقات خلال کرتے کرتے اس زمانے کو یاد کر کے اُن کا گلا رندھ جاتا جب بکریاں اللہ میاں کی گائے ہُوا کرتی تھیں۔

ہم نے انہیں نشہ کرتے نہیں دیکھا۔ تاہم ان کا دعویٰ تھا کہ میرے لڑکپن میں سرولی آم خربوزے کے برابر ہوتے ہیں۔ ہم نے کبھی اس کی تردید نہیں کی۔ اس لئے کہ ہم اپنے گئے گزرے زمانے میں روزانہ ایسے خربوزے بکثرت دیکھ رہے تھے جو واقعی آم کے برابر تھے! بات سرولی پر ہی ختم ہو جاتی تو صبر آ جاتا، لیکن وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ اگلے وقتوں کے لوگ بھی غضب کے لمبے چوڑے ہوتے تھے۔ ثبوت کے طور پر اپنے تایا ابّا کی رسولی کے سائز کا حوالہ دیتے جو مقامی میڈیکل کالج نے اسپرٹ میں محفوظ کر رکھی تھی۔ کہتے تھے آپ صرف اِسی سے اُن کی صحّت کا اندازہ کر لیجیے۔ یہ سُن کر ہم سب ایک دُوسرے کا

مُنہ دیکھنے لگتے، اس لیے کہ اوّل تو ہمارے بُزرگ اُن کے بزرگوں کے مقابلے میں ابھی بچے ہی تھے۔ دوم، ہم سے کِسی کے بُزرگ کی رسولی ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔

اس کلجگ کا اثر جہاں اور چیزوں، خصوصاً اشیائے خورونوش پر پڑا، وہاں موسم بھی اس کے چنگل سے نہ بچ سکا۔ اوائل جنوری کی ایک سرد شام تھی۔ آغا نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا، کیا وقت آ لگا ہے! ورنہ بیس سال پہلے جنوری میں اس کڑاکے کی سردی نہیں پڑتی تھی کہ پنج وقتہ تیمّم کرنا پڑے۔ چگی ڈاڑھی والے درویش نے سوال کیا، کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ تم اس زمانے میں عید کی نماز پڑھتے تھے؟ لیکن بہت کُچھ بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ محکمۂ موسمیات کے ریکارڈ سے آغا کو قائل کیا جائے۔

آغا دونوں ہاتھ گھٹنوں میں دے کر بولے "صاحب! ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ بیس برس پہلے اِتنی کم سردی پڑتی تھی کہ ایک پتلی سی دُلائی میں پسینہ آنے لگتا تھا اور اب پانچ سیر رُوئی کے لحاف میں بھی سردی نہیں جاتی! کیا سمجھے؟"

وہ کُچھ اور دلائل بھی پیش کرنا چاہتے تھے لیکن اُن کی کٹکٹی بندھ گئی اور بحث ایک دفعہ پھر انھی کے حق میں ختم ہو گئی۔

قدیم نصابِ تعلیم کے وہ بے حد معرف و مدّاح تھے۔ اکثر کہتے کہ ہمارے بچپن میں کتابیں اتنی آسان ہوتی تھیں کہ بچّے تو بچّے، اُن کے والدین بھی سمجھ سکتے تھے۔ اسی رو میں اپنی یونیورسٹی کا ذکر بڑی للک سے کرتے اور کہتے کہ ہمارے وقتوں میں ممتحن اِتنے لائق ہوتے تھے کہ کوئی لڑکا فیل نہیں ہو سکتا تھا۔ قسمیں کھا کھا کر ہمیں یقین دلاتے کہ ہماری یونیورسٹی میں فیل ہونے کے لیے غیر معمولی قابلیت درکار تھی۔ جس شہر میں یونیورسٹی واقع تھی، اسے وہ عرصے سے اُجڑا دیار کہنے کے عادی تھے۔ ایک دن میں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”آغا! خُدا سے ڈرو! وہ شہر تمہیں اُجاڑ دکھائی دیتا ہے؟ حالانکہ وہاں کی آبادی پانچ ہزار سے بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہو گئی ہے!“

”مسلمان ہو؟“

”ہوں تو۔“

”دوزخ پر ایمان ہے؟“

”ہے۔“

”وہاں کی آبادی بھی تو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے! کیا سمجھے؟“

اختر شیرانی کی ایک بڑی مشہور نظم ہے جس میں انہوں نے یارانِ وطن کی خیر و عافیت پُوچھنے کے بعد، دیس سے آنے والے کی خاصی خبر لی ہے۔ اِس بھولے بھالے سوال نامے کے تیور صاف کہہ رہے ہیں کہ شاعر کو یقینِ واثق ہے کہ اُس کے پردیس سدھارتے ہی نہ صرف دیس کی ریت رسم بلکہ موسم بھی بدل گیا ہو گا۔ اور ندی نالے اور تالاب سب ایک ایک کر کے سُوکھ گئے ہوں گے۔ آغا کو اپنے آبائی گاؤں چاکسُو (خُورد) سے بھی کُچھ اِسی نوع کی توقعات وابستہ تھیں۔

چاکسُو (خورد) دراصل ایک قدیم گاؤں تھا جو چاکسُو کلاں سے چھوٹا تھا۔ یہاں لوگ اب تک ہوائی جہاز کو چیل گاڑی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ لیکن آغا اپنے لعابِ ذہن سے اس کے گرداگرد یادوں کا ریشمی جالا بُنتے رہے، یہاں تک کہ اُس نے ایک تہ دار کوئے کی شکل اختیار کر لی جِسے چیر کر (آغا کا تو کیا ذکر) جمیع باشندگانِ چاکسُو باہر نہیں نِکل سکتے تھے۔ ادھر چند دنوں سے وہ ان تنگ و تاریک گلیوں کو یاد کر کے زار و قطار رو رہے تھے، جہاں بقول ان کے جوانی کھوئی تھی۔ حالانکہ ہم سب کو ان کی سوانح عُمرِی میں سوانح کم، اور عُمر زیادہ نظر آتی تھی لیکن جب اُن کے یادش بخیریا نے شدّت اختیار کی تو دوستوں میں یہ صلاح ٹھہری کہ ان کو دو تین مہینے کے لیے اسی گاؤں میں بھیج دیا جائے جس کی زمین اُن کو حافظے کی خرابی کے سبب چہارم آسمان دکھائی دیتی ہے۔

چنانچہ گزشتہ مارچ میں آغا ایک مدّت مدید (تیس سال) کے بعد اپنے گاؤں گئے۔ لیکن وہاں سے لوٹے تو کافی آزردہ تھے۔ انہیں اس بات سے رنج پہنچا کہ جہاں پہلے ایک جوہڑ تھا جس میں دن بھر بھینسیں اور ان کے مالکوں کے بچّے پڑے رہتے تھے، وہاں پر اب ایک پرائمری اسکول کھڑا تھا۔ اس میں انہیں صریحاً چاکسُو کلاں والوں کی شرارت معلوم ہوتی تھی۔ جُوں تُوں ایک دن وہاں گزارا اور پہلی ٹرین سے اپنی پُرانی یونیورسٹی پہنچے۔ مگر وہاں سے بھی شاموں شام واپس آئے۔ بے حد مغموم و گرفتہ دل۔ انہیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یونیورسٹی اب تک چل رہی ہے! ان جیسے حسّاس آدمی کے لیے بڑے دُکھ اور اچنبھے کی بات تھی کہ وہاں مارچ میں اب پھُول کھِلتے ہیں اور گلاب سُرخ اور سبزہ ہرا ہوتا ہے۔ دراصل ایک مثالی "اولڈ بوائے" کی طرح وہ اس وقت تک اس صحّت مند غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ساری چونچالی اور تمام خوش دِلی اور خوش باشی ان کی نسل پر ختم ہوگئی۔

آغا کی عمر کا بھید نہیں کھلا۔ لیکن جن دِنوں میرا تعارف ہُوا، وُہ عمر کی اس کٹھن گھاٹی سے گزر رہے تھے جب جوان اُن کو بوڑھا جان کر کتراتے اور بوڑھے کل کالونڈا سمجھ کر مُنہ نہیں لگاتے تھے۔ جن حضرات کو آغا اپنا ہم عمر بتاتے رہے، اِن میں سے اکثر اُن کو مُنہ در مُنہ چچا کہتے تھی۔ خیر، اُن کی عمر کچھ بھی ہو، مگر

میرا خیال ہے کہ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو کبھی جوان نہیں ہوتے۔ جب کبھی وہ اپنی جوانی کے قصّے سنانے بیٹھتے تو نوجوان ان کو یکسر فرضی سمجھتے۔ وہ غلطی پر تھے۔ کیونکہ قصّے ہی نہیں، ان کی ساری جوانی قطعی فرضی تھی۔ ویسے یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ اس لیے کہ بعض اشخاص عمر کی کسی نہ کسی منزل کو پھلانگ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ سعدی کے متعلق یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ کبھی بچّہ رہے ہوں گے۔ حالی جوان ہونے سے پیشتر بُڑھا گئے۔ مہدی الافادی جذباتی اعتبار سے، ادھیڑ پیدا ہوئے اور ادھیڑ مرے۔ شبلی نے عمرِ طبیعی کے خلاف جہاد کر کے ثابت کر دیا کہ عشق عطیہ قدرت ہے۔ پیرو جواں کی قید نہیں۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اور اختر شیرانی جب تک جیئے دائمی نوجوانی میں مبتلا رہے اور آخر اِسی میں انتقال کیا۔ اِس سے اختر شیرانی کی تنقیص یا آغا کی مذمّت مقصُود نہیں کہ میرے کانوں میں آج بھی آغا کے وہ الفاظ گونج رہے ہیں جو انہوں نے ٹیگور پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہے تھی "برا مانو یا بھلا۔ لیکن جوان مولوی اور بوڑھے شاعر پر اپنا دِل تو نہیں ٹھکتا۔ کیا سمجھے؟"

اُن کی شادی کے متعلق اتنی ہی روایتیں تھیں جتنے ان کے دوست! بعضوں کا کہنا تھا کہ بی۔ اے کے نتیجے سے اس قدر بد دِل ہُوئے کہ خود کُشی کی ٹھان لی۔ بوڑھے والدین نے سمجھایا کہ بیٹا خود کُشی نہ کرو، شادی کر لو۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ مگر ابھی سہرے کے پھُول بھی پوری طرح نہ مُرجھائے ہوں گے کہ یہ فکر لاحق ہو گئی کہ بچپن انہیں اسیر پنجۂ عہد شباب کر کے کہاں چلا گیا اور وہ اپنی آزادی کے ایام کو بے طرح یاد کرنے لگے۔ حتّٰی کہ اُس نیک بخت کو بھی رحم آ گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے اپنے میکے چلی گئی۔

اس سے مہر بخشوانے کے ٹھیک پندرہ سال بعد ایک مُسِن خاتون کو محض اس بنا پر حبالۂ نکاح میں لائے کہ پینتیس سال اور تین شوہر قبل موصوفہ نے چاکسُو میں اُن کے ساتھ اماوس کی رات میں آنکھ مچولی کھیلتے وقت چٹکی لی تھی۔ جس کا نِیل ان کے حافظے میں جُوں کا تُوں محفوظ تھا۔ لیکن آغا اپنی عادت سے مجبُور تھے۔ اس کے سامنے اپنی پہلی بیوی کی اٹھتے بیٹھتے اس قدر تعریف کی کہ اس نے بہت جلد طلاق لے لی۔ اتنی جلد کہ ایک دِن انگلیوں پر حساب لگایا تو بے چاری کی ازدواجی زندگی، عِدّت کی میعاد سے بھی مختصر نِکلی! آغا ہر سال نہایت پابندی اور دھُوم دھام سے دونوں طلاقوں کی سالگرہ منایا کرتے تھے۔ پہلی طلاق کی سلور جوبلی راقم الحروف کو بھی شرکت کا اِتفاق ہُوا۔

دوسری خانہ بربادی کے بعد شادی نہیں، اگرچہ نظر میں آخری دم تک سہرے کے پھُول کھِلتے اور مہکتے رہے۔

یوں ترنگ میں ہوں تو انہیں ہر عاقل و بالغ خاتون میں اپنی اہلیہ بننے کی صلاحیت نظر آتی تھی۔ ایسے نازک و نایاب لمحات میں وہ کتابوں کی الماری سے بیئر پینے کا ایک گلاس نکالتے جو ایک یادگار نمائش سے دُودھ پینے کے لیے خریدا تھا۔ اب اس میں سکنجبین بھر کے جرعہ جرعہ حلق میں انڈیلتے رہتے اور ماضی کے نشہ سے سرشار ہو کر خُوب بہکتے۔ اپنے آپ پر سنگین تہمتیں لگاتے اور عورت ذات کو نقصان پہنچانے کے ضمن میں ۵۵ سالہ منصوبوں کا اعلان کرتے جاتے۔ پھر جیسے جیسے عُمر اور ناتجربہ کاری بڑھتی گئی وہ ہر خاموش خاتون کو نیم رضامند سمجھنے لگے۔ نہ جانے کیوں اور کیسے انہیں یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ حوّا کی ساری نسل انہی کی گھات میں بیٹھی ہے۔ مگر کسی اللہ کی بندی کی ہمّت نہیں پڑتی کہ اُن کی پُر غرور گردن میں گھنٹی باندھ دے۔ لیکن سوائے آغا کے سب جانتے تھے کہ وہ صنفِ نازک کے حضُور ہمیشہ سر تاپا! بن کر گئے جب کہ انہیں مجسّم ؟ ہونا چاہیے تھا۔ ایک دن چگی ڈاڑھی والے درویش نے دبی زبان سے کہا کہ آغا تم دہلیز ہی چُومتے رہ گئے۔ دستک دینے کی ہمّت تمہیں کبھی نہیں ہُوئی۔ ہنسے۔ کہنے لگے،

میاں! ہم تو درویش ہیں۔ اِک گھونٹ لیا، دِل شاد کیا، خوش ہُوئے اور چل نکلے۔ ملنگ کے دِل میں سبیل پر قبضہ کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔

سینما دیکھنے کے شائق تھے۔ اگرچہ اس کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ صرف وہ تصویریں چاؤ سے دیکھتے جِن میں اُن کے زمانے کی محبوب ایکٹر سیں ہیروئن کا رول ادا کر رہی ہوں۔ مگر دِقّت یہ تھی کہ ان کے چہرے یا تو اب اسکرین پر نظر ہی نہیں آتے تھے، یا پھر ضرورت سے زیادہ نظر آ جاتے تھے۔ اُن میں سے جو حیات تھیں، اور چلنے پھرنے کے قابل، وہ اب ہیروئن کی نانی اور ساس کا رول نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ آغا کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ البتہ چھٹے چھماہے "پکار" یا "ماتا ہری" قسم کی فِلم آ جاتی تو آغا کے دِل کا کنول کِھل جاتا۔ چگی ڈاڑھی والے درویش کا بیان ہے کہ آغا گریٹا گاربو پر محض اِس لیے فریفتہ تھے کہ وہ انہی کی عُمروں تھی۔ ہر چند اس قبیل کی فلمیں دیکھ کر ہر تندرست آدمی کو اپنی سماعت اور بصارت پر شبہ ہونے لگتا۔ لیکن آغا کو ان کے مناظر اور مکالمے ازبر ہو چکے تھے اور وہ اس معاملے میں، ہماری آپ کی طرح، اپنے حواس خمسہ کے چنداں محتاج نہ تھے۔ یہ باسی فلمیں دیکھتے وقت انہیں ایک باڑھ پر آئے ہوئے بدن کی جانی پہچانی تیز اور تُرش مہک آتی جو اپنے ہی وجود کے کسی گوشے سے پُھوٹتی ہُوئی محسوس ہوتی تھی۔

باسی پھُول میں جیسے خوشبو، پھُول پہننے والے کی ان کے مِٹتے ہُوئے نقوش میں اور ان مقامات پر جہاں پچیس سال پہلے دِل بُری طرح دھڑکا تھا، انہیں ایک بچھڑے ہُوئے ہم زاد کا عکس دکھائی دیتا جو وقت کے اُس پار انہیں بُلا رہا تھا۔

سب جانتے تھے کہ آغا کی زندگی بہت جلد ایک خاص نقطے پر پُہنچ کر ساکن ہو گئی۔ جیسے گراموفون کی سُوئی کسی میٹھے بول پر اٹک جائے۔ لیکن کم احباب کو علم ہو گا کہ آغا اپنے ذہنی ہکلے پن سے بے خبر نہ تھے۔ اکثر کہا کرتے کہ جس وقت میرے ہم سن کبڈی میں وقت ضائع کرتے ہوتے، تو میں اکیلا جوہڑ کے کنارے بیٹھا اپنی یادداشت سے ریت اور گارے کا لال قلعہ بناتا جسے میں نے پہلی بار اُس زمانے میں دیکھا تھا جب حلوا سوہن کھاتے ہُوئے پہلا دُودھ کا دانت ٹوٹا تھا۔ بڑے ہو کر آغا نے شاہ جہانی شغل (ہمارا اشارہ حلوا سوہن سے دانت اکھاڑنے کی طرف نہیں، تعمیر قلعہ جات کی طرف ہی) ترک نہیں کیا۔ بس ذرا ترمیم کر لی۔ اب بھی وہ یادوں کے قلعے بناتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب بہتر مسالہ لگاتے اور ریت کے بجائے اصلی سنگِ مرمر وافر مقدار میں استعمال کرتے۔ بلکہ جہاں صرف سِل کی گنجائش ہوتی، وہاں دو لگاتے۔ نیز بُرج اور مینار نقشے کے مطابق بے جوڑ ہاتھی دانت کے بناتے۔ مدّت العمر شیشے کی فصیلوں پر اپنی منجنیق

نصب کر کے وہ بالشتیوں کی دُنیا پر پتھراؤ کرتے رہے۔ اِن قلعوں میں غنیم کے داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بلکہ اپنے نکلنے کا بھی کوئی راستہ نہیں رکھا تھا۔

یہ نہیں کہ انہیں اس کا احساس نہ ہو۔ اپنا حال ان پر بخوبی روشن تھا۔ اس کا علم مجھے یوں ہوا کہ ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں یہ بحث چل نکلی کہ ماضی سے لگاؤ ضعف پیدا کرتا ہے۔ پہلے درویش (جن کا روپیہ ان کی جوانی سے پہلے جواب دے گیا) نے تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ جتنا وقت اور روپیہ بچّوں کو "مُسلمانوں کے سائنس پر احسانات" رٹانے میں صرف کیا جاتا ہے، اس کا دسواں حصّہ بھی بچوں کو سائنس پڑھانے میں صرف کیا جائے تو مسلمانوں پر بڑا احسان ہو گا۔ غور کیجئے تو امریکہ کی ترقی کا سبب یہی ہے کہ اس کا کوئی ماضی نہیں۔ چگی ڈاڑھی والا درویش گویا ہُوا "قدیم داستانوں میں بار بار ایسے آسیبی صحرا کا ذکر آتا ہے، جہاں آدمی پیچھے مُڑ کر دیکھ لے تو پتھّر کا ہو جائے۔ یہ صحرا ہمارے اپنے من کے اندر ہے، باہر نہیں!" پہلے درویش نے بِپھر کر دیومالا سے منطقی نتیجہ نکالتے ہُوئے کہا۔ "اپنے ماضی سے شیفتگی رکھنے والوں کی مثال ایک ایسی مخلوق کی سی ہے جِس کی آنکھیں گدّی کے پیچھے لگی ہُوئی ہوں۔ چھان بین کیجئے تو بات بات پر "یاد آیا میکہ"، اور "یادش بخیر" کی ہانک لگانے والے وہی نکلیں گے جن کا مستقبل نہیں۔"

آغا نے یک لخت ماضی کے مرغزاروں سے سر نکال کر فائر کیا۔ "یادش بخیر کی بھی ایک ہی رہی۔ اپنا تو عقیدہ ہے کہ جسے ماضی یاد نہیں آتا اس کی زندگی میں شاید کبھی کچھ ہُوا ہی نہیں۔ لیکن جو اپنے ماضی کو یاد ہی نہیں کرنا چاہتا وُہ یقیناً لوفر رہا ہو گا۔ کیا سمجھے؟"

مدّتیں گزریں۔ ٹھیک یاد نہیں بحث کِن دِل آزار مراحل سے گزرتی اس تجریدی نکتے پر آ پہنچی کہ ماضی ہی اٹل حقیقت ہے۔ اس لیے کہ ایک نہ ایک دن یہ اژدھا حال اور مستقبل دونوں کو نگِل جائے گا۔ دیکھا جائے تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ، ہر آن اور ہر پل ماضی کی جیت ہو رہی ہے۔ آنے والا کل آج میں اور آج گزرے ہُوئے کل میں بدل جاتا ہے۔ اس پر پہلے درویش نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ ایشیا کا حال اس شخص جیسا ہے جس نے گئے جنم کی تمنّا میں خود کُشی کر لی۔

مشرق نے کبھی پل کے رُوپ سُروپ سے پیار کرنا نہیں سیکھا۔ جینا ہے تو پھسلتے سرسراتے لمحے کو دانتوں سے پکڑو۔ گزرتے لمحے کو بے جھجک چھاتی سے لگاؤ، اس کی نَس نَس میں ماضی کا نیم گرم خُون دوڑ رہا ہے۔ اسی کی جیتی جیتی کوکھ سے مستقبل جنم لے گا۔ اور اپنی چھل بل دکھا کر آخر اسی طرف لوٹے گا۔

یہاں چگی ڈاڑھی والے درویش نے اچانک بریک لگایا "آپ کے ننّھے مُنّے لمحے کے نجیب الطرفین ہونے میں کیا کلام ہے۔ لیکن بیتی ہُوئی گھڑیوں کی آرزو کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹوتھ پیسٹ کو واپس ٹیوب میں گھسانا! لاکھ یہ دنیا ظلمت کدہ سہی۔ لیکن کیا اچھّا ہو کہ ہم ماضی کے دُھندلے خاکوں میں چیختے چنگھاڑتے رنگ بھرنے کی بجائے حال کو روشن کرنا سیکھیں۔"

آغا نے ایک بار پھر تُرپ پھینکا۔ "بھئی ہم تو باورچی خانے پر سفیدی کرنے کے قائل نہیں!"

بات یہ ہے کہ بہت کم لوگ جی داری سے ادھیڑ پن کا مقابلہ کر پاتے ہیں۔ غبی ہوں تو اس کے وجود سے ہی منحرف۔ اور ذرا ذہین ہوں تو پہلا سفید بال نظر پڑتے ہی اپنی کایا کو ماضی کی اندھی سُرنگ کے خنک اندھیروں میں ٹھنڈا ہونے کے لیے ڈال دیتے ہیں۔ اور وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیتے جب تک کہ وقت ان کے سروں پر برف کے گالے نہ بکھیر دے۔ بال سفید کرنے کے لیے اگرچہ کسی تیاگ اور تپسیا کی ضرورت نہیں۔ تاہم ایک رچی بسی باوقار سُپردگی کے ساتھ بوڑھے ہونے کا فن اور ایک آن کے ساتھ پسپا ہونے کے پینترے بڑی مشکل سے آتے ہیں۔ اور ایک بڑھاپے پر ہی موقوف نہیں۔ حُسن اور جوانی سے بہرہ

یاب ہونے کا سلیقہ بھی کچھ کچھ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب واہ ایک گہری آہ اور آہ ایک لمبی کراہ میں بدل چکی ہوتی ہے۔

قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ جب وہ دانت دیتی ہے تو چنے نہیں ہوتے۔ اور جب چنے دینے پر آتی ہے تو دانت ندارد۔ آغا کا المیہ یہ تھا کہ جب قُدرت نے اُن کو دانت اور چنے دونوں بخشے تو انہوں نے دانتوں کو استعمال نہیں کیا۔ لیکن جب دانت عدم استعمال سے کمزور ہو کر ایک ایک کر کے گِر گئے تو انہیں پہلی دفعہ چنوں کے سوندھے وجود کا احساس ہُوا۔ پہلے تو بہت سٹپٹائے۔ پھر دانتوں کو یاد کر کے خُود روتے اور دُنیا کو رُلاتے رہے۔ عبارت آرائی بر طرف، امر واقعہ یہ ہے کہ آغا نے بچپن اور جوانی میں بجز شطرنج کے کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ حد یہ کہ جُوتے کے تسمے بھی کھڑے کھڑے اپنے نوکروں سے بندھوائے۔ مگر جو نہی پچپن کے پیٹے میں آئے، اس بات سے بڑے رنجیدہ رہنے لگے کہ اب ہم تین قِسطوں میں بھی ایک بیٹھک نہیں لگا سکتے۔ اس میں وہ قدرے غلو سے کام لیتے تھے۔ کیونکہ ہم نے بچشمِ خود دیکھا کہ نہ صرف ایک ہی ہلّے میں اڑ اڑا کے بیٹھ جاتے، بلکہ اکثر و بیشتر بیٹھے ہی رہ جاتے۔ اِس لحاظ سے چگی ڈاڑھی والے درویش بھی کچھ کم نہ تھے۔ زندگی بھر کیرم کھیلا اور جاسوسی ناول پڑھے۔ اب اِن حالوں کو پہنچ گئے تھے کہ اپنی سالگرہ کے کیک کی موم بتیاں تک پھُونک مار کر نہیں بُجھا

سکتے تھے۔ لہٰذا ان کے نواسے کو پنکھا جھل کر بجھانا پڑتی تھیں۔ اس کے علاوہ نظر اتنی موٹی ہو گئی تھی کہ عورتوں نے ان سے پردہ کرنا چھوڑ دیا۔ عُمر کا اندازہ بس اس سے کر لیجیے کہ تین مصنوعی دانت تک ٹوٹ چکے تھے۔

بایں سامانِ عاقبت، شکلا جی اور آغا کے سامنے اکثر رُباعی کے پردے میں اپنی ایک آرزو کا برملا اظہار کرتے جسے کم و بیش نصف صدی سے اپنا خُون پلا پلا کر پال رہے تھے۔

خلاصہ اس دائمی حسرت کا یہ تھا کہ ننانوے سال کی عُمر پائیں اور مرنے سے پہلے ایک ۔۔بس ایک بار۔۔ مجرمانہ دست درازی میں ماخوذ ہوں۔ ایک دفعہ زکام میں مُبتلا تھے۔ مجھ سے فرمائش کی "میاں! میری رُباعی ترنّم سے پڑھ کر سُناؤ۔" میں نے تامّل کیا، فرمایا "پڑھو بھی۔ شرع اور شاعری میں کاہے کی شرم!"

گو آغا تمام عمر رہین ستم ہائے روزگار رہے لیکن چاکسُو کی یاد سے ایک لحظہ غافل نہیں رہے۔ چنانچہ ان کی میت آخری وصیت کے مطابق سات سو میل دُور چاکسُو خورد لے جائی گئی۔ اور چاکسُو کلاں کی جانب پاؤں کر کے اُسے قبر میں اُتارا گیا۔

لاریب وہ جنتی تھے۔ کیونکہ وہ کسی بُرے میں نہیں تھے۔ اُنہوں نے اپنی ذات کے علاوہ کبھی کسی کو گزند نہیں پہنچایا۔ ان کے جنّتی ہونے میں یوں بھی شبہ نہیں کہ جنت واحد ایسی جگہ ہے جس کا حال اور مستقبل اس کے ماضی سے بہتر نہیں ہو سکتا!

لیکن نہ جانے کیوں میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ وہ جنّت میں بھی خوش نہیں ہوں گے اور یادش بخیر کہہ کر جنتیوں کو اسی جہانِ گزراں کی داستان پاستاں سُنا سُنا کر للچاتے ہوں گے جِسے جیتے جی دوزخ سمجھتے رہے۔

موذی

مرزا کرتے وہی ہیں جو ان کا دل چاہے۔ لیکن اس کی تاویل عجیب و غریب کرتے ہیں۔ صحیح بات کو غلط دلائل سے ثابت کرنے کا یہ ناقابل رشک ملکہ شاذ و نادر ہی مردوں کے حصّے میں آتا ہے۔ اب سگرٹ ہی کو لیجیے۔ ہمیں کسی کے سگرٹ نہ پینے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن مرزا سگرٹ چھوڑنے کا جو فلسفیانہ جواز ہر بار پیش کرتے ہیں وہ عام آدمی کے دماغ میں بغیر آپریشن کے نہیں گھس سکتا۔

مہینوں وہ یہ ذہین نشین کراتے رہے کہ سگرٹ پینے سے گھریلو مسائل پر سوچ بچار کرنے میں مدد ملتی ہے اور جب ہم نے اپنے حالات اور اُن کی حجّت سے قائل ہو کر سگرٹ شروع کر دی اور اس کے عادی ہو گئے تو انہوں نے چھوڑ دی۔ کہنے لگے، بات یہ ہے کہ گھریلو بجٹ کے جن مسائل پر میں سگرٹ پی پی کر غور کیا کرتا تھا، وہ دراصل پیدا ہی کثرتِ سگرٹ نوشی سے ہوئے تھے۔

ہمیں غور و فکر کی لت لگانے کے بعد اُنہوں نے آنا جانا موقوف کر دیا جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ واقعی تائب ہو گئے ہیں اور کسی سے ملنا جُلنا پسند نہیں کرتے بالخصوص سگرٹ پینے والوں سے (انہی کا قول ہے کہ بڑھیا سگرٹ پیتے ہی ہر شخص کو معاف کر دینے کو جی چاہتا ہے (خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو)۔ میں گیا بھی تو کھنچے کھنچے رہے اور چند دن بعد ایک مشترک دوست کے ذریعہ کہلوایا کہ ”اگر میں نے بر بنائے مجبوری سگرٹ پینے کی قسم کھا لی تھی تو آپ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ زبردستی پِلا دیتے۔ میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں“

سات مہینے تک سگرٹ اور سوسائٹی سے اجتناب کیا۔ لیکن خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ آخر ایک دن جب وہ وعظ سُن کر خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے تو انہیں بس میں ایک سگرٹ لائٹر پڑا مِل گیا۔ چنانچہ پہلے ہی بس اسٹاپ پر اُتر پڑے اور لپک کر گولڈ فلیک سگرٹ کا ڈبہ خریدا (ہمیں واقعہ پر قطعاً تعجب نہیں ہوا۔ اس لیے کہ گزشتہ کرسمس پر انہیں کہیں سے نائیلون کے موزے چار آنے رعایت سے مل گئے تھے، جن کو ”میچ“ کرنے کے لیے انہیں ایک دوست سے قرض لے کر پورا سوٹ سِلوانا پڑا) سگرٹ اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں میں دبا

کر لائٹر جلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ اندر کے تمام پرزے غائب ہیں۔ اب ماچس خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔

ہم نے اکثر یہی دیکھا کہ مرزا پیغمبری لینے کو گئے اور آگ لے کر لوٹے!

اور دوسرے دن اچانک غریب خانے پر گاڑھے گاڑھے دھوئیں کے بادل چھا گئے، جن میں سے مرزا کا مُسکراتا ہوا چہرہ رفتہ رفتہ طُلوع ہوا۔ گِلے شکوے تمام ہوئے تو نتھنوں سے دُھواں خارج کرتے ہوئے بشارت دی کہ سگرٹ میرے لیے مُوجبِ نشاط نہیں، ذریعہ نجات ہے۔

اتنا کہہ کر انہوں نے چُٹکی بجا کر اپنے نجات دہندہ کی راکھ جھاڑی اور قدرے تفصیل سے بتانے لگے کہ سگرٹ نہ پینے سے حافظے کا یہ حال ہو گیا کہ ایک رات پولیس نے بغیر بتّی کے سائیکل چلاتے ہوئے پکڑ لیا تو اپنا صحیح نام اور ولدیت تک نہ بتا سکا، اور بفضلِہ اب یہ عالم ہے کہ ایک ہی دن میں آدھی ٹیلیفون ڈائریکٹری حفظ ہو گئی۔ مجھے لاجواب ہوتا دیکھ کر انہوں نے فاتحانہ انداز سے دوسری سگرٹ سُلگائی۔ ماچس احتیاط سے بجھا کر ہونٹوں میں دبالی اور سگرٹ ایش ٹرے میں پھینک دی۔

کبھی وہ اس خوشی میں سگرٹ پیتے ملیں گے آج رمی میں جیت کر اُٹھے ہیں۔ اور کبھی (بلکہ اکثر و بیشتر) اس تقریب میں آج تو بالکل ککھ ہو گئے۔ ان کا دوسرا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ سگرٹ سے غم غلط ہوتا ہے تو ان کے غموں کے مجموعی تعداد بہ شرح پچاس غم یومیہ، اٹھارہ ہزار سالانہ کے لگ بھگ ہو گی اور بعض غم تو اتنے ضدّی ہوتے جارہے ہیں کہ جب تک تین چار سگرٹوں کی دھونی نہ دی جائے تو ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ انہیں عبرت دلانے کے ارادے سے میں نے بادشاہ مطرید لطیس ششم کا قصّہ سنایا۔ جو یوں ہے کہ جب اس کو ہمہ وقت یہ اندیشہ لاحق رہنے لگا کہ موقع پا کر کوئی بدخواہ اسے زہر کِھلا دے گا تو اس نے خود ہی روزانہ تھوڑا تھوڑا زہر کھانا شروع کر دیا تا کہ خون اور قویٰ عادی ہو جائیں ۔اور وہ اس حفظِ ماتقدم میں اس حد تک کامیاب ہوا کہ جب حالات سے مجبور ہو کر اس نے واقعی خود کُشی کرنے کی کوشش کی تو زہر بالکل بے اثر ثابت ہوا اور اس نے بمشکل تمام اپنے ایک غلام کو خنجر گھونپنے پر رضامند کیا۔

بولے ”ناحق بے چارے غلام کو گنہ گار کیا۔ اگر خود کُشی ہی کرنا تھی تو زہر کھانا بند کر دیتا۔ چند ہی گھنٹوں میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔“

لیکن جو احباب ان کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے یہ غم ابدی اور آفاقی ہوتے ہیں جن کا سگرٹ تو در کنار حُقّے سے بھی علاج نہیں ہو سکتا۔ میں نے اکثر انہیں اس غم میں سگرٹ کے کش پر کش لگاتے دیکھا ہے کہ سوئی گیس کا ذخیرہ سو سال میں ختم ہو گیا تو ان کی اپنی ملازمت کا کیا ہو گا؟ یا ایک لاکھ سال بعد انسان کے سر پر بال نہ ہوں گے تو حجاموں اور سِکّھوں کا کیا حشر ہو گا؟ اور جب سورج پچاس ارب سال بعد بالکل ٹھنڈا پڑ جائے گا تو ہم گھُپ اندھیرے میں صبح کا اخبار کیسے پڑھیں گے؟

ایک دفعہ تو سب کو یقین ہو گیا کہ مرزا نے واقعی سگرٹ چھوڑ دی۔ اس لیے کہ مفت کی بھی نہیں پیتے تھے اور ایک ایک سے کہتے پھرتے تھے کہ اب بھولے سے بھی سگرٹ کا خیال نہیں آتا۔ بلکہ روزانہ خواب میں بھی سگرٹ بجھی ہوئی ہی نظر آتی ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ اب کی دفعہ کیوں چھوڑی؟

ہوا میں پھونک سے فرضی دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے بولے "یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جو روپیہ سگرٹ میں پھونک رہا ہوں، اس سے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا جا سکتا ہے۔ کسی بیوہ کی مدد ہو سکتی ہے۔"

”مرزا! بیمے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن جب تک نام پتہ معلوم نہ ہو، یہ بیوہ والی بات میری سمجھ نہیں آئے گی۔“

”پھر یوں سمجھ لو کہ بیمے سے اپنی ہی بیوہ کی امداد ہو سکتی ہے۔ لیکن مذاق برطرف، سگرٹ چھوڑنے میں ہے بڑی بچت! جو صرف اس طرح ممکن ہے کہ جب بھی پینے کی خواہش ہو، یہ فرض کر لو کہ پی لی۔ اس طرح ہر بار تمھارا ڈیڑھ آنہ بچ جائے گا۔“

میں نے دیکھا کہ اس فارمولے سے مرزا نے بارہا ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ روپے بچائے۔ ایک روز دس روپے کی بچت دکھا کہ انہوں نے مجھ سے پانچ روپے ادھار مانگے تو میں نے کہا ”غضب ہے! دن میں دس روپے بچانے کے باوجود مجھ سے پانچ روپے قرض مانگ رہے ہو؟“

کہنے لگے ”اگر یہ نہ بچاتا تو اس وقت تمہیں پندرہ دینے پڑتے۔“

مجھے اس صورت حال میں سراسر اپنا ہی فائدہ نظر آیا۔ لہٰذا جب بھی پانچ روپے قرض دیئے، یہ سمجھ کر دیئے کہ اُلٹا مجھے دس روپے کا نقد منافع ہو رہا ہے۔ مرزا کے متواتر تعاون کی بدولت میں نے اس طرح دو سال کی قلیل مدت میں ان سے چھ سو روپے کما لیے۔

پھر ایک سہانی صبح کو دیکھا کہ مرزا دائیں بائیں دھوئیں کی کلیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا "ہائیں مرزا! یہ کیا بد پرہیزی ہے؟" جواب دیا "جن دنوں سگرٹ پیتا تھا کسی اللہ کے بندے نے اُلٹ کر نہ پوچھا کہ میاں کیوں پیتے ہو؟ لیکن جس دن سے چھوڑی، جِسے دیکھو یہی پوچھتا ہے کہ خیر تو ہے کیوں چھوڑ دی؟ بالآخر زِچ ہو کر میں نے پھر شروع کر دی! بھلا یہ بھی کوئی منطق ہے کہ قتل عمد کے محرکات سمجھنے کے لیے آپ مجرموں سے ذرا نہیں پوچھتے کہ تم لوگ قتل کیوں کرتے ہو؟ اور ہر راہ گیر کو روک روک کر پوچھتے ہیں کہ سچ بتاؤ تم قتل کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے سمجھایا "مرزا! اب پیمانے بدل گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاڑھی کو ہی لو۔"

الجھ پڑے "ڈاڑھی کا قتل سے کیا تعلق؟"

"بندہ خدا! پوری بات تو سُنی ہوتی۔ میں کہہ رہا تھا کہ اگلے زمانے میں کوئی شخص ڈاڑھی نہیں رکھتا تھا تو لوگ پوچھتے تھے کیوں نہیں رکھتے؟ لیکن اب کوئی ڈاڑھی رکھتا ہے تو سب پوچھتے ہیں کیوں رکھتے ہو؟"

ان کا دعویٰ کہ نکوٹین ان کے خون میں اس حد تک حل ہو گئی ہے کہ ہر صبح پلنگ کی چادر جھاڑتے ہیں تو سینکڑوں کھٹمل گرتے ہیں۔ یقیناً یہ نکوٹین ہی کے اثر سے کیفرِ کردار کو پہنچتے ہوں گے۔ ورنہ اوّل تو یہ ناسمجھ جِنس اتنی کثیر تعداد میں متحد ہو کر خودکُشی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ دوم، آج تک سوائے انسان کے کسی ذی روح نے اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر خودکُشی نہیں کی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مرزا اپنے خون کو خراب ثابت کرنے میں کچھ مبالغہ کرتے ہوں۔ لیکن اتنا تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ سگرٹ کے دھوئیں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ صاف ہوا سے کھانسی اٹھنے لگتی ہے۔ اور اگر دو تین دن تک سگرٹ نہ ملے تو گلے میں خراش ہو جاتی ہے۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا (اور ہم نے مرزا سے بہت پہلے ہوش سنبھالا) مرزا کے منہ میں سگرٹ ہی دیکھی۔ ایک مرتبہ ہم نے سوال کیا کہ تمھیں یہ شوق کِس نے لگایا تو انہوں نے لطیفے داغنے شروع کر دیے۔

"اللہ بخشے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بچوں کو سگرٹ نہیں پینا چاہیے۔ اس سے آگ لگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود ہم پیتے رہے۔ عرصے تک گھر

والوں کو یہی غلط فہمی رہی کہ ہم محض بزرگوں کو چڑانے کے لیے سگرٹ پیتے ہیں۔"

"مگر میں نے پوچھا تھا کہ یہ چسکا کس نے لگایا؟"

"میں نے سگرٹ پینا اپنے بڑے بھائی سے سیکھا جب کہ ان کی عمر چار سال تھی۔"

"اس رفتار سے انہیں اب تک قبر میں ہونا چاہیے۔"

"وہ وہیں ہیں!"

اس کے باوجود مرزا کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ عادتاً سگرٹ پیتے ہیں۔ یہ مسئلہ جب بھی زیرِ بحث آیا، انہوں نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ سگرٹ کسی گمبھیر فلسفے کے احترام میں یا محض خلقِ خدا کے فائدے کے لیے پی رہے ہیں۔

طوعاً و کرہاً! کوئی تین برس ادھر کی بات ہے کہ شُدہ شُدہ مجھ تک یہ خبر پہنچی کہ مرزا پھر تائب ہو گئے اور کامل چھتیس گھنٹے سے ایک سگرٹ نہیں پیا۔ بھاگم بھاگ مبارک باد دینے پہنچا تو نقشہ ہی اور پایا۔ دیکھا کہ تہنیت گزاروں کا

ایک غول رات سے ان کے ہاں فروکش ہے۔ خاطر مدارات ہو رہی ہے۔ مرزا انہیں سگرٹ پلا رہے ہیں اور وہ مرزا کو۔ مرزا ماچس کی ڈبیا پر ہر ایک فقرے کے بعد دو انگلیوں سے تال دیتے ہوئے کہہ رہے تھے:

"بحمد اللہ! (تال) میں جُوا نہیں کھیلتا (تال) شراب نہیں پیتا (تال) تماش بینی نہیں کرتا (تال) اب سگرٹ بھی نہ پیؤں تو بڑا کفرانِ نعمت ہو گا" (تین تال)

میں نے کہا "لاحول ولا قوّۃ! پھر یہ عِلّت لگالی؟"

مجمع کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر فرمایا "یارو! تم گواہ رہنا کہ اب کی بار فقط اپنی اصلاح کی خاطر توبہ توڑی ہے۔ بات یہ ہے کہ آدمی کوئی چھوٹی موٹی عِلّت پال لے تو بہت سی بڑی عِلّتوں سے بچا رہتا ہے ۔یہ کمزوریاں (MINOR VICES) انسان کو گناہِ کبیرہ سے باز رکھتی ہیں۔ اور یاد رکھو کہ دانا وہی ہے جو ذرا محنت کر کے اپنے ذات میں کوئی ایسا نمایاں عیب پیدا کر لے جو اس کے اصل عیبوں کو ڈھانپ لے۔"

"اپنے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔"

اپنے ستار عیوب کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "یہ پیؤ گے تو خود بخود سمجھ میں آ جائے گا۔ اس فلسفے میں قطعی کوئی اینچ پینچ نہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا۔

اگر کوئی شخص خوش قسمتی سے گنجا، لنگڑا یا کانا ہے تو اس کا یہ سطحی عیب لوگوں کو اس قدر متوجہ کر لیتا ہے کہ اس عیبوں کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی۔ مثال میں جولیس سیزر، تیمور لنگ اور رنجیت سنگھ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ویسے کسی سو فیصدی پارسا آدمی سے مل کر کسی کا جی خوش نہیں ہوتا تم جانتے ہو کہ میں آوارہ اوباش نہیں، فاسق و فاجر نہیں، ہر جائی اور ہری چُگ نہیں۔ لیکن آج بھی (یہاں مرزا نے بہت سا لذیذ دھواں چھوڑا)۔ لیکن آج بھی کسی خوبصورت عورت کے متعلق یہ سُنتا ہوں کہ کہ وہ پارسا بھی ہے تو نہ جانے کیوں دل بیٹھ سا جاتا ہے۔"

"مرزا! سگرٹ سبھی پیتے ہیں مگر تم اس انداز سے پیتے ہو گویا بد چلنی کر رہے ہو!"

"کسی اچھے بھلے کام کو عیب سمجھ کر کیا جائے تو اس میں لذّت پیدا ہو جاتی ہے۔ یورپ اس گُر کو ابھی نہیں سمجھ پایا۔ وہاں شراب نوشی عیب نہیں۔ اسی لیے اس میں وہ لطف نہیں آتا۔"

"مگر شراب تو واقعی بری چیز ہے! البتہ سگرٹ پینا بری بات نہیں۔"

"صاحب! چار سگرٹ پہلے یہی بات میں نے ان لوگوں سے کہی تھی۔ بہر کیف میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ سگرٹ پینا گناہِ صغیرہ ہے۔ مگر غصّہ مجھے ان

سادہ لوح حضرات پر آتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سگرٹ نہ پینا ثواب کا کام ہے۔ مانا کہ جھوٹ بولنا اور چوری کرنا بری بات ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ حکومت ان کو ہر بار سچ بولنے اور چوری نہ کرنے پر طلائی تمغہ دے گی۔"

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ مرزا تمام دن لگاتار سگرٹ پیتے مگر ماچس صرف صبح جلاتے تھے۔ شمار یاد نہیں۔ لیکن ان کا اپنا بیان ہے آج کل ایک دن میں بیس فٹ سگرٹ پی جاتا ہوں اور وہ بھی اس شکل میں کہ سگرٹ عموماً اس وقت تک نہیں پھینکتے، جب تک انسانی کھال جلنے کی چراند نہ آنے لگے۔ آخر ایک دن مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا مرزا! آخر کیا ٹھانی ہے؟

میری آنکھوں میں دھواں چھوڑتے ہوئے بولے "کیا کروں۔ یہ موذی نہیں مانتا۔"

مرزا اپنے نفس امّارہ کو (جس کا محلِ وقوع ان کے نزدیک گردن کے جنوب مغربی علاقے میں ہے) اکثر اسی نام سے یاد کرتے، چمکارتے اور للکارتے ہیں۔

میں نے کہا ”فرائڈ کے نظریہ کے مطابق سگرٹ پینا ایک رجعتی اور بچکانہ حرکت ہے۔ جنسی لحاظ سے ناآسودہ افراد سگرٹ کے سرے کو غیر شعوری طور پرNIPPLEکا نعم البدل سمجھتے ہیں۔“

”مگر فرائڈ تو انسانی دماغ کو ناف ہی کا ضمیمہ سمجھتا ہے!“

”گولی مارو فرائڈ کو! بندہ خدا! اپنے آپ پر رحم نہیں آتا تو کم از کم اس چھوٹی سی بیمہ کمپنی پر ترس کھاؤ جس کی پالیسی تو نے لی ہے۔ نئ نئ کمپنی ہے۔ تمھاری موت کی تاب نہیں لاسکتی۔ فوراً دیوالے میں چلی جائے گی۔“

”آدمی اگر قبل از وقت نہ مر سکے تو بیمے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔“

”مرزا! بات کو مذاق میں نہ اڑاؤ۔ اپنی صحت کو دیکھو۔ پڑھے لکھے آدمی ہو۔ اخبار اور رسالے سگرٹ کی برائی میں رنگے پڑے ہیں۔“

”میں خود سگرٹ اور سرطان کے بارے میں اتنا کچھ پڑھ چکا ہوں کہ اب مطالعہ سے نفرت ہو گئی!“ انہوں نے چٹکلہ دہرایا۔

اس مد میں بچت کی جو مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مرزا سارے دن مانگ تانگ کر سگرٹ پیتے ہیں۔ (ماچس وہ اصولاً اپنی ہی

استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ماچس مانگنا بڑی بے عزّتی کی بات ہے۔ آڑے وقت میں رسید لکھ کر کسی سے سو دو سو روپے لینے میں سُبکی نہیں ہوتی۔ لیکن رسید کا ٹکٹ بھی اسی سے مانگنا شانِ قرض داری کے خلاف ہے) دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسے مارکہ کی سگرٹوں پر اتر آتے ہیں جن کو وہ پیکٹ کی بجائے سگرٹ کیس میں رکھنا اور الٹی طرف سے جلانا ضروری خیال کرتے ہیں۔

لیکن نو دس ماہ پیشتر جب موذی اس طرح بھی باز نہ آیا تو مرزا نے تیسرا اور آخری حربہ استعمال کیا۔ یعنی سگار پینا شروع کر دیا جو ان کے ہاتھ میں چھڑی اور منہ میں نفیری معلوم ہوتا تھا۔ پینے، بلکہ نہ پینے، کا انداز یہ تھا کہ ڈرتے ڈرتے دو تین اوپری کش لے کر احتیاط سے بجھا دیتے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اوسان درست ہونے پر پھر جلا لیتے تھے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طریقۂ استعمال سے طلب بھی مٹ جاتی ہے اور سگار کی عمر بڑھ جاتی ہے سو الگ (یہاں اتنا اور عرض کر دوں تو نامناسب نہ ہو گا کہ انہوں نے اپنی جوانی کو بھی اسی طرح سینت سینت کر رکھنا چاہا، اس لیے قبل از وقت بوڑھے ہو گئے)۔ چنانچہ ایک ہی سگار کو دن بھر "آف" اور "آن" کرتے رہتے۔ پھر چراغ جلے اسی کو ٹیکتے ہوئے کافی ہاؤس پہنچ جاتے۔ خلقِ خدا ان کو غائبانہ کیا کہتی ہے، اس پر انہوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ لیکن ایک دن دھواں مُنہ کا مُنہ میں رہ گیا، جب انہیں اچانک یہ پتہ چلا

کہ ان کا جلتا بجھتا سگار اب ایک طبقاتی علامت (سمبل) بن چکا ہے۔ ہوا یہ کہ کافی ہاؤس کے ایک نیم تاریک گوشے میں آغا عبد العلیم جام منہ لٹکا بیٹھے تھے۔ مرزا کہیں پوچھ بیٹھے کہ آغا آج بجھے بجھے سے کیوں ہو؟ آغا نے اپنی خیریت اور دیگر احوال سے یوں آگاہی بخشی:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے سِگار مفلس کا

ایک ایسی ہی اداس شام کی بات ہے۔ مرزا کافی ہاؤس میں موذی سے بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے اور سِگار کے یوں کش لگا رہے تھے گویا کسی را کھشش کا دم نکال رہے ہیں۔ میں نے دل بڑھانے کو کہا "تم نے بہت اچھا کیا کہ سگرٹ کا خرچ کم دیا۔ روپے کی قوتِ خرید دن بدِن گھٹ رہی ہے۔ دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ خرچ کم کرو اور بچاؤ زیادہ۔"

سِگار کو سپیرے کی پونگی کی مانند دھونکتے ہوئے بولے "میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آج کل ایک آنے میں ایک سالم سگرٹ مل جاتا ہے۔ دس سال بعد آدھی ملے گی!"

میں نے بات آگے بڑھائی۔ "لیکن ہم یہی ایک آنہ آج پَس انداز کر لیں تو دس سال بعد معہ سُود دو آنے ہو جائے گے۔"

"اور اس دونی سے ہم ایک سالم سگرٹ خرید سکیں گے جو آج صرف ایک آنے میں مل جاتی ہے!"

جملہ مکمل کرتے ہی مرزا نے اپنا جلتا ہوا عصا زمین پر دے مارا۔ چند لمحوں بعد جب دھوئیں کے بادل چھٹے تو مرزا کے اشارے پر ایک بیرا پلیٹ میں سگرٹ لیے نمودار ہوا اور مرزا ایک آنے میں دو آنے کا مزہ لوٹنے لگے۔

پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ابھی تین ہفتے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کسی نے مرزا کو پٹّی پڑھا دی کہ سگرٹ ترک کرنا چاہتے ہو تو حقّہ شروع کر دو۔ ان کے لیے یہ ہومیو پیتھک مشورہ کچھ ایسا نیا بھی نہ تھا۔ کیوں کہ ہومیو پیتھی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ چھوٹا مرض دور کرنے کے لیے کوئی بڑا مرض کھڑا کر دو۔ چنانچہ مریض نزلے کی شکایت کرے تو دوا سے نمونیہ کے اسباب پیدا کر دو۔ پھر مریض نزلے کی شکایت نہیں کرے گا۔ ہومیو پیتھی کی کرے گا!

بہرحال، مرزا نے حقّہ شروع کر دیا۔ اور وہ بھی اس اہتمام سے کہ گھنٹوں پہلے پیتل سے منڈھی ہوئی چلم اور نقشین فرشی، لیمو اور کپڑے سے اتنی رگڑی جاتی کہ جگر جگر کرنے لگتی۔ نیچہ عرق گلاب سے تر کیا جاتا۔ نے پر موتیا کے ہار لپیٹے جاتے۔ مہنال کیوڑے میں بسائی جاتی۔ ایک حقّہ بھی قضا ہو جاتا تو ہفتوں اس کا

افسوس کرتے رہتے۔ بندھا ہوا معمول تھا کہ پینے سے پہلے چار پانچ منٹ تک قوام کی تعریف کرتے اور پینے کے بعد گھنٹوں "ڈیٹول" سے کلیاں کرتے۔ اکثر دیکھا کہ حقّہ پیتے جاتے اور کھانستے جاتے اور کھانسی کے مختصر وقفے میں سگرٹ کی برائی کرتے جاتے۔ فرماتے تھے کہ "کسی دانا نے سگرٹ کی کیا خوب تعریف کی ہے- ایک ایسا سلگنے والا بدبودار مادہ جس کے ایک سرے پر آگ اور دوسرے پر احمق ہوتا ہے۔ لیکن مشرقی پیچوان میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کم سے کم جگہ گھیر کر تمباکو کو زیادہ سے زیادہ فاصلے پر کر دیا جائے۔"

میں نے کہا "یہ سب درست! مگر اس کا پینا اور پلانا دردِ سر یہ بھی تو ہے اس سے بہتر تو پائپ رہے گا۔ تند بھی ہے اور سستا کا سستا۔"

چلم کے انگاروں کو دہکاتے ہوئے بولے "بھائی! اس کو بھی آزما چکا ہوں تمہیں شاید معلوم نہیں کہ پائپ میں تمباکو سے زیادہ ماچس کا خرچ بیٹھتا ہے ورنہ یہ بات ہرگز نہ کہتے۔ دو ماہ قبل ایک انگلش پائپ خرید لایا تھا۔ پہلے ہی روز نہار منہ ایک گھونٹ لیا تو پیٹ میں ایک غیبی گھونسا سا لگا۔ آنکھ میچ کے دو چار گھونٹ اور لیے تو باقاعدہ باکسنگ ہونے لگی۔ اب اس پائپ سے بچیاں اپنی گڑیوں کی شادی میں شہنائی بجاتی ہیں۔"

سن ء

اوروں کا حال معلوم نہیں، لیکن اپنا تو یہ نقشہ رہا کہ کھیلنے کھانے کے دن پانی پت کی لڑائیوں کے سن یاد کرنے، اور جوانی دیوانی نپولین کی جنگوں کی تاریخیں رٹنے میں کٹی۔ اس کا قلق تمام عمر رہے گا کہ جو راتیں سِکھّوں کی لڑائیوں کے سن حفظ کرنے میں گزریں، وہ ان کے لطیفوں کی نذر ہو جاتیں تو زندگی سنور جاتی۔ محمود غزنوی لائق صد احترام سہی، لیکن ایک زمانے میں ہمیں اس سے بھی یہ شکایت رہی کہ سترہ حملوں کی بجائے اگر وہ جی کڑا کر کے ایک ہی بھرپور حملہ کر دیتا تو آنے والی نسلوں کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتیں (ہمارا اشارہ مشکلات کی طرف ہے)۔

اولادِ آدم کے سر پر جو گزری ہے، اس کی ذمّہ داری مشاہیر عالم پر عائد ہوتی ہے۔ یہ نِری تہمت طرازی نہیں بلکہ فلسفۂ تاریخ ہے، جس سے اس وقت ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ بنی نوع آدم کو تواریخ نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا مؤرخین نے۔ انہوں نے اس کی سادہ اور مختصر سی داستان کو

یادگار تاریخوں کا ایک ایسا کیلنڈر بنا دیا جس کے سبھی ہندسے سرخ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ طلباء بوجوہِ معقول ان کے حق میں دُعائے مغفرت نہیں کر سکتے اور اَب ذہن بھی ان تعینات زمانی کا اس حد تک خوگر ہو چکا ہے کہ ہم وجودِ انسانی کا تصور بلاقید وسن وسمبت کر ہی نہیں سکتے:

جو سن نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے، جو ہم نہ ہوتے تو غم نہ ہوتا

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مورخین سن کو ایک طلسمی طوطا سمجھتے ہیں جس میں وقت کے ظالم دیو کی روح مقید ہے۔ کچھ اسی قسم کے عقیدے پر میل بورن کے خضر صورت آرچ بشپ مانکس نے تین سال پہلے طنز کیا تھا کہ جب ان کی ۳۹ویں سالگرہ پر ایک اخبار کے رپورٹر نے اپنی نوٹ بک نکالتے ہوئے بڑے گمبھیر لہجے میں دریافت کیا:

”آپ کے نزدیک ۳۹ کی عمر تک پہنچنے کی اصل وجہ کیا ہے؟“

”برخوردار! اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں ۱۸۶۴ء میں پیدا ہُوا تھا۔“

میٹرک کے امتحان سے کچھ دن قبل مرزا عبدالودود بیگ نے اس راز کو فاش کیا (ہرچند کہ طلبا اس کھولا نہیں کرتے) کہ شقی القلب ممتحن بھی سنہ ہی سے قابو میں آتے ہیں۔ چنانچہ زیرک طالب علم ہر جواب کی ابتدا کسی نہ کسی سنہ سے

کرتے ہیں۔ خواہ سوال سے اس کا دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ ذاتی مشاہدے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ ایسے ایسے غبّی لڑکے جو نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی میں کبھی تمیز نہ کر سکے، آج تک چنگیز خاں کو مسلمان سمجھتے ہیں، محض اس وجہ سے فرسٹ کلاس آئے کہ انہیں قتلِ عام کی صحیح تاریخ اور پانی پت کی حافظہ شکن جنگوں کے سن از بر تھے۔ خود مرزا، جو میٹرک میں بس اس وجہ سے اوّل آ گئے کہ انہیں مرہٹوں کی تمام لڑائیوں کی تاریخیں یاد تھیں، پرسوں تک اہلیہ بائی کو شیوا جی کی رانی سمجھے بیٹھے تھے۔ میں نے ٹوکا تو چمک کر بولے:

"یعنی کمال کرتے ہیں آپ بھی! اگر شیوا جی نے شادی نہیں کی تو نانا فرنویس کس کا لڑکا تھا؟"

ترقّی یافتہ ممالک میں مارچ کا مہینہ بے حد بہار آفرین ہوتا ہے۔ یہ وہ رُت ہے جس میں سبزہ اوس کھا کھا کر ہرا ہوتا ہے اور ایک طرف دامنِ صحرا موتیوں سے بھر جاتا ہے تو دوسری طرف

موجہ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال

اس تمہیدِ دل پذیر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ اس کے برعکس پس ماندہ ممالک میں اس مست مہینے میں پت جھڑ ہوتا ہے اور

بجائے گُل چمنوں میں کمر کمر ہے کھاد

توجہ صرف اس امر کی جانب دلانا چاہتا ہوں کہ برِّ صغیر میں یہ فصلِ گُل آبادی کے سب سے معصوم اور بے گناہ طبقے کے لیے ہر سال ایک نئے ذہنی کرب کا پیغام لاتی ہے، جس میں چار سال سے لے کر چوبیس سال کی عمر تک کے سبھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سالانہ امتحانوں کا موسم ہوتا ہے۔ خدا جانے محکمہ تعلیم نے اس زمانے میں امتحانات رکھنے میں کونسی ایسی مصلحت دیکھی، ورنہ عاجز کی رائے میں اس ذہنی عذاب کے لیے جنوری اور جون کے مہینے نہایت مناسب رہیں گے۔ یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ کلاسیکی ٹریجڈی کے لیے خراب موسم انتہائی ضروری تصور کیا گیا ہے۔

بات سے بات نکل آئی، ورنہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اب جو پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو یک گونہ افسوس ہوتا ہے کہ عمرِ عزیز کی پندرہ سولہ بہاریں اور میوہ ہائے باغِ جوانی اسی سالانہ جان کُنی کی نذر ہو گئی۔ یادش بخیر! وہ سلونا موسم جس کو اگلے وقتوں کی زبان میں 'جوانی کی راتیں، مُرادوں کے دن، کہتے ہیں، شاہ جہان کے چاروں بیٹوں کی لڑائیاں اور فرانس کے تلے اوپر اٹھارہ لوئیوں کے سنِ ولادت و وفات یاد کرنے میں بسر ہوا اور تنہا فرانس کا کیا مذکور، برطانیہ کی تاریخ میں بھی

چھ عدد جارج اور آٹھ آٹھ ایڈورڈ اور ہنری گزرے ہیں، جن کی پیدائش اور تخت نشینی کی تاریخیں یاد کرتے کرتے زبان پر کانٹے اور حافظے میں نیل پڑ گئے تھے۔ ان میں ہنری ہشتم سب سے کٹھن اور کٹھور نکلا۔ اس لیے کہ اس کی اپنی تخت نشینی کے علاوہ ان خواتین کی تاریخ وفات بھی یاد کرنا پڑی جن کو اس نے اپنے اوپر حلال کر رکھا تھا اور جنہیں باری باری تختہ نصیب ہوا۔

قیاس کہتا ہے کہ تاریخی نام رکھنے اور تاریخ وفات کہنے کا رواج اسی مشکل کو حل کرنے کی غرض سے پھیلا ہو گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی مدد سے حافظے کو ایسی تاریخیں یاد رکھنے میں آسانی ہوتی ہے، جن کا بھول جانا ہی بہتر ہوتا۔ بعض شعراء بہ نظرِ احتیاط ہر سال اپنا قطعہ تاریخ وفات کہہ کر رکھ لیتے ہیں تاکہ مرنے کی سند رہے اور وقت ضرورت پسماندگان کے کام آئے۔ کون واقف نہیں کہ مرزا غالب نے جو مرنے کی آرزو میں مرتے تھے، متعدد بار اپنی تاریخ رحلت کہہ کر شاگردوں اور قرض خواہوں کو خواہ مخواہ ہراساں کیا ہو گا۔ لیکن جب قدرت نے ان کو مرنے کا ایک سنہری موقع فراہم کیا تو یہ کہہ کر صاف ٹال گئے کہ وبائے عام میں مرنا ہماری کسرِ شان ہے۔

مارچ ۱۹۴۲ کا ذکر ہے۔ بی ،اے کے امتحان میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں روہیلوں کی لڑائیوں سے فارغ ہو کر مرزا عبدالودود بیگ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ جھوم جھوم کر کچھ رَٹ رہے ہیں۔ پوچھا "خیام پڑھ رہے ہو؟"

کہنے لگے "نہیں تو! ہسٹری ہے۔"

"مگر آثار تو ہسٹیریا کے ہیں!"

اپنی اپنی جگہ دونوں سچّے تھے۔ انہوں نے غلط نہیں کہا، اگرچہ میرا خیال بھی صحیح نکلا کہ وہ شعر سے شُغل فرمارہے ہیں۔ البتہ شعر پڑھتے وقت چہرے پر مِرگی کی سی کیفیت میں نے قوّالوں کے سوا کسی اور کے چہرے پر اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ پھر خود ہی کہنے لگے "چلو ہسٹری کی طرف تو اب بے فکری ہو گئی۔ قبلہ نانا جان نے پچاس مشاہیر کی تاریخ ولادت ووفات کے قطعے کہہ کر میرے حوالے کر دیئے ہیں۔ جن میں سے آدھے حفظ کر چکا ہوں۔" اس کے بعد انہوں نے تیمور لنگ کی پیدائش اور رنجیت سنگھ کی رحلت کے قطعات بطور نمونہ گا کر سُنائے۔

گھر پہنچ کر تخمینہ لگایا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ فی کس دو قطعات کے حساب سے اس شاہنامہ ہند کے چار سو مصرعے ہوئے اور اس میں وہ ذیلی قطعات شامل نہیں

جن کا تعلق دیگر واقعات و موضوعات (مثلاً جانا پر تھوی راج کا سوئمبر میں بھیس بدل کر اور لے بھاگنا سنجو گتا کو گھوڑے پر۔ آنا نادر شاہ کا ہندوستان میں واسطے لینے کوہ نور ہیرا، برابر انڈے مرغابی کے۔ داخل ہونا واجد علی شاہ کا پہلے پہل مٹیا برج میں معہ چھ بیگمات کے اور یاد کرنا بقیہ بیگمات کو) یا تاریخی چھٹ بھیوں (ثانوی ہیرو) مثلاً رانا سانگا، ہیموں بقال، نظام سقّہ وغیرہ سے تھا۔ ایک قطعہ میں تو ضلع جگت پر اتر آئے تھے۔ یہ اس نیم تاریخی حادثے سے متعلق تھا، جب نور جہاں کے ہاتھ سے کبوتر اُڑ گیا اور جہانگیر نے اس کو (یعنی نور جہان کو) پہلی بار "خصم گیں" نگاہوں سے دیکھا۔

حالانکہ دماغی طور پر میں پانی پت کی لڑائیوں میں بری طرح زخمی ہو چکا تھا، لیکن آخری قطعہ کو سُن کر میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ امتحان میں باعزّت طریقے سے فیل ہونا اس اوچھے ہتھیار سے ہزار درجہ بہتر ہو گا۔ بہر حال مرزا نے ایک ہفتے بعد اس کلید کامیابی کو امتحان میں بے دریغ استعمال کیا، جس میں انہیں دو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی دشواری تو یہ کاپی میں قطعات اور حروفِ ابجد کا حساب دیکھ کر کمرۂ امتحان کا نگراں، جو ایک مدراسی کرسچین تھا، بار بار ان کے پاس لپک کر آتا اور سمجھتا کہ اردو کا پرچہ کل ہے۔ مرزا جھنجھلا کر جواب دیتے کہ یہ ہمیں بھی معلوم ہے تو وہ نرمی سے پوچھتا کہ پھر یہ تعویذ کیوں

لکھ رہے ہو؟ پایانِ کار مرزا نے وہیں کھڑے کھڑے اس کو فنِ تاریخ گوئی اور استخراج سنین کے رموز و نکات سے غلط انگریزی میں آگاہ کیا۔ حیرت سے اس کا منہ ے کے ہندسہ کی مانند پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ حروف و اعداد کو بھکی بھکی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا:

"تعجب ہے کہ تم لوگ ماضی کے واقعات کا پتہ بھی علمِ نجوم سے لگا لیتے ہو!"

اس مجسم دشواری کے علاوہ دوسری دِقّت یہ ہوئی کہ ابھی پانچوں سوالات کے جملہ بادشاہوں، راجاؤں اور متعلقہ جنگوں کے عدد اور سن بہ سہولت تمام نکلے بھی نہ تھے کہ وقت ختم ہو گیا اور نگراں نے کاپی چھین لی۔ بڑی منت و سماجت کے بعد مرزا کو کاپی پر اپنا رول نمبر لکھنے کی اجازت ملی۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مجھے سن یاد نہیں رہتا اور مرزا کو وہ واقعہ یاد نہیں رہتا جو اس سن سے متعلق ہو۔ فرض کیجئے۔ مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ فرانسیسی انقلابیوں نے کسی صدی کے آخر میں قلعہ باستیل کا محاصرہ کیا تھا۔ لیکن سن یاد نہیں آتا۔ اب مرزا کو یقیناً اتنا یاد ہو گا کہ ۱۷۹۹ء میں کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی تھی۔ لیکن کہاں ہوئی اور کیوں ہوئی، یہ وہ بغیر استخارہ کیے نہیں بتا سکتے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۴ء ہی کا ذکر ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی کمزوری پر افسوس کر رہے

تھے اور لقمہ دیتے جاتے تھے۔ وہ اس طرح کہ وہ مجھے روس کی بیوہ ملکہ کیتھرین اعظم کا سن ولادت اور تاریخ تاج پوشی وغیرہ بتا رہے تھے اور میں ان کو اس کے منہ بولے شوہروں کے نام رٹوا رہا تھا۔ اچانک مرزا بولے یار! یہ بڑے مر کے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں

میں نے کہا "کارلائل کا قول ہے کہ تاریخ مشاہیر کی سوانح عمری ہے۔"

کہنے لگے "سچ تو کہتا ہے بے چارا! تاریخ بڑے آدمیوں کا اعمال نامہ ہے جو غلطی سے ہمارے ہاتھ تھما دیا گیا۔ اب یہ نہ پوچھو کس نے کیا کیا، کیسے کیا اور کیوں کیا۔ بس یہ دیکھو کہ کب کیا۔"

عرض کیا "دیکھو تم پھر سن اور سمبت کے پھیر میں پڑ گئے۔ ایک مفکّر کہتا ہے۔۔۔۔۔"

بات کاٹ کر بولے "بھئی تم اپنے اچھے بھلے خیالات بڑے آدمیوں سے کیوں منسوب کر دیتے ہو؟ لوگ غور سے نہیں سُنتے۔"

مکرّر عرض کیا "واقعی ایک مفکّر کہتا ہے کہ عظیم انقلابات کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ تم دیکھو گے زبردست تبدیلیاں ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہیں۔ تاریخی کیلنڈر میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ سکندر نے کِس سن میں کون سا ملک فتح کیا۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ بن مانس کون سے سن میں انسان بنا۔ اتنا تو اسکول کے بچے بھی بتا دیں گے کہ سیفو کب پیدا ہوئی اور سقراط نے کب زہر کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگایا لیکن آج تک کوئی مؤرّخ یہ نہیں بتا سکا کہ لڑکپن کس دن رخصت ہوا۔ لڑکی کس ساعتِ نایاب میں عورت بنی۔ جوانی کس رات ڈھلی۔ ادھیڑ پن کب ختم ہوا اور بڑھاپا کس گھڑی شروع ہوا۔"

کہنے لگے "برادر! ان سوالات کا تعلق تاریخ یونان سے نہیں، طبِّ یونانی سے ہے۔"

سنہ عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل اُن تاریخوں کا یاد رکھنا ہے جن کے بعد میں "قبل مسیح" آتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں مؤرخین گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑاتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ذہنی شیِس آسن کرنا پڑتا ہے جو اتنا ہی دشوار ہے جتنا اُلٹے پہاڑے سُنانا۔ اس کو طالب علم کی خوش قسمتی کہیے کہ تاریخ قبل میلادِ مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔ اگرچہ مؤرخین کوشاں ہیں کہ

جدید تحقیق سے بے زبان بچّوں کی مشکلات میں اضافہ کر دیں۔ بھولے بھالے بچّوں کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل ۷۵۳ قبل مسیح میں پڑی تو ننھے مُنّے ہاتھ اٹھا کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو یہ پتہ کیسے چل گیا ہے کہ حضرت عِیسیٰ کے پیدا ہونے میں ابھی ۷۵۳ سال باقی ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ ۷۵۳ ق۔ م کو ساتویں صدی شمار کریں یا آٹھویں۔ عقل مند استاد ان جاہلانہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں۔ آگے چل کہ جب یہی بچےّ پڑھتے ہیں کہ سکندر ۳۵۶ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ ق ۔م میں فوت ہوا تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا؟ استاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچّو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔

کلاسیکی شاعر اور اِنشا پرداز کچھ سوچ کر چپ ہو جانے کے نازک فن سے آشنا ہے۔ بالخصوص ان مقامات پر جہاں لُطفِ گویائی کو لذّت خموشی پر قربان کر دینا چاہیے۔ وہ اس ”جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں“ زندگی کو وقت کے پیمانوں سے نہیں ناپتا اور سن وسال کی اُلجھنوں میں نہیں پڑتا۔ چنانچہ وہ یہ صراحت نہیں کرتا کہ جب مِصر کو انطونی نے اور انطونی کو قلوپطرہ نے تسخیر کیا تو اس گرم و سیز رچشیدہ ملکہ کی کیا عمر تھی۔ شیکسپئر محض یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ

وقت اس کے لازوال حسن کے سامنے ٹھہر جاتا ہے، اور عمر اس کا رُوپ اور رَس نہیں چُرا سکتی۔ اس کے بر خلاف مؤرخین نے دفتر کے دفتر اس لایعنی تحقیق میں سیاہ کر ڈالے ہیں کہ اپنے صندلی ہاتھوں کی نیلی نیلی رگوں پر اِترانے والی اس عورت کی اس وقت کیا عمر ہو گی۔ اب ان سے کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ جب خود انطونی نے امورِ سلطنت اور سنِ ولادت کے بارے میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تو آپ کیوں اپنے کو اس غم میں خواہ مخواہ ہلکان کیے جا رہے ہیں؟ اسی طرح جس وقت ہمارا اِنشا پرواز اس جنسی جھٹ پٹے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے جب دھوپ ڈھل جاتی ہے مگر دھرتی بھیتر ہی بھیتر میٹھی میٹھی آنچ میں تپتی رہتی ہے، تو اپنی پسند کے جواز میں بس اتنا کہہ کر آنکھوں ہی آنکھوں مُسکرا دیتا ہے کہ "چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں زیادہ خوش گوار ہوتی ہے۔"

اس اعتبار سے ان خواتین کا کلاسیکی طرزِ عمل لائقِ تحسین و تقلید ہے، جو اپنی پیدائش کی تاریخ اور مہینہ ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ لیکن سَن بھول جاتی ہیں۔

اور یہ واقعہ ہے کہ حافظہ خراب ہو تو آدمی زیادہ عرصہ تک جوان رہتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وقت کا احساس بذاتِ خود ایک آزار ہے، جس کو اصطلاحاً بڑھاپا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے غلط نہیں کہا "یوں تو مجھے دو بیماریاں ہیں – دمہ اور

جلندھر۔ لیکن تیسری بیماری لاعلاج ہے اور وہ ہے عمرِ طبعی!" لیکن غور کیجئے تو عمر بھی ضمیر اور جوتے کی مانند ہے، جن کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دینے لگیں۔ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا کہ اگر سَن پیدائش یاد رکھنے کا رواج بیک گردشِ چرخِ نیلوفری اُٹھ جائے، تو بال سفید ہونے بند ہو جائیں گے۔ یا اگر کیلنڈر ایجاد نہ ہوا ہوتا تو کسی کے دانت نہ گرتے۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ جس شخص نے بھی ناقابلِ تقسیم رواں دواں وقت کو پہلی بار سیکنڈ، سال اور صدی میں تقسیم کیا، اس نے انسان کو صحیح معنوں میں پیری اور موت کا ذائقہ چکھایا۔ وقت کو انسان جتنی بار تقسیم کرے گا، زندگی کی رفتار اتنی ہی تیز اور نتیجۃً موت اتنی ہی قریب ہوتی جائے گی۔ اب جب کہ زندگی اپنے آپ کو کافی کے چمچوں اور گھڑی کی ٹِک ٹِک سے ناپتی ہے، تہذیب یافتہ انسان اس لوٹ کر نہ آنے والے نیم روشن عہد کی طرف پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا ہے، جب وہ وقت کا شمار دل کی دھڑکنوں سے کرتا تھا اور عروس نورات ڈھلنے کا اندازہ کانوں کے موتیوں کے ٹھنڈے ہونے اور ستاروں کے جھلملانے سے لگاتے تھے:

نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ　　نہ شمارِ وقت وساعت

مگر اے چمکنے والو! ہو تمہیں اُنہیں سجھاتے

کہ گئی ہے رات کِتنی

جنونِ لطیفہ

بڑا مبارک ہوتا ہے وہ دن، جب کوئی نیا خانساماں گھر میں آئے اور اس سے بھی زیادہ مبارک وہ دن جب وہ چلا جائے۔ چونکہ ایسے مبارک دن سال میں کئی بار آتے ہیں اور تلخی کام و دہن کی آزمائش کر کے گزر جاتے ہیں، اس لیے اطمینان کا سانس لینا، بقول شاعر، صرف دو ہی موقعوں پر نصیب ہوتا ہے:

اِک ترے آنے سے پہلے اِک ترے جانے کے بعد

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بد ذائقہ کھانا پکانے کا ہنر صرف تعلیم یافتہ بیگمات کو آتا ہے۔ لیکن ہم اعداد و شمار سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پیشہ ور خانساماں اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔ اسی وجہ سے پچھلے سو برس سے یہ فن کوئی ترقی نہیں کر سکے۔ ایک دن ہم نے اپنے دوست مرزا عبد الودود بیگ سے شکایتاً کہا کہ

اب وہ خانساماں جو ستّر قسم کے پلاؤ پکا سکتے تھے، من حیث الجماعت رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ جواب میں انہوں نے بالکل اُلٹی بات کہی۔

کہنے لگے ”خانساماں وانساماں غائب نہیں ہو رہے، بلکہ غائب ہو رہا ہے، وہ ستّر قسم کے پلاؤ کھانے والا طبقہ جو بٹلر اور خانساماں رکھتا تھا اور اُرھڑ کی دال بھی ڈِنر جیکٹ پہن کر کھاتا تھا۔ اب اس وضع دار طبقے کے افراد باورچی نوکر رکھنے کے بجائے نکاحِ ثانی کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ گیا گزرا باورچی بھی روٹی کپڑا اور تنخواہ مانگتا ہے۔ جبکہ منکوحہ فقط روٹی کپڑے پر ہی راضی ہو جاتی ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر کھانے اور پکانے کے برتن بھی ساتھ لاتی ہے۔“

مرزا اکثر کہتے ہیں کہ خود کام کرنا بہت آسان ہے مگر دوسروں سے کام لینا نہایت دشوار۔ بالکل اسی طرح جیسے خود مرنے کے لیے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن دوسروں کو مرنے پر آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ معمولی سپاہی اور جرنیل میں یہی فرق ہے۔ اب اسے ہماری سخت گیری کہیے یا نااہلی یا کچھ اور کوئی خانساماں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹِکتا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ہنڈیا اگر شبراتی نے چڑھائی تو بگھار رمضانی نے دیا اور دال بلاقی خاں نے بانٹی۔ ممکن ہے مذکور الصّدر حضرات اپنی صفائی میں یہ کہیں کہ:

ہم وفادار نہیں تو بھی تو دل دار نہیں!

لہٰذا ہم تفصیلات سے احتراز کریں گے۔ حالانکہ دل ضرور چاہتا ہے کہ ذرا تفصیل کے ساتھ منجملہ دیگر مشکلات کے اس سراسیمگی کو بیان کریں جو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہم سے ازروئے حساب یہ دریافت کرنے کو کہا جائے کہ اگر نوکر کی ۱۳ دن کی تنخواہ ۳۰ روپے اور کھانا ہے تو ۹ گھنٹے کی تنخواہ بغیر کھانے کے کیا ہو گی؟ ایسے نازک مواقع پر ہم نے سوال کو آسان کرنے کی نیت سے اکثر یہ معقول تجویز پیش کی کہ اس کو پہلے کھانا کھلا دیا جائے۔ لیکن اوّل تو وہ اس پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتا۔ دوم کھانا تیار ہونے میں ابھی پورا سوا گھنٹہ باقی ہے اور اس سے آپ کو اصولاً اتفاق ہو گا کہ ۹ گھنٹے کی اجرت کا حساب سوا دس گھنٹے کے مقابلے میں پھر بھی آسان ہے۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہ انصاف کے طالب۔ کچھ تو اس اندیشے سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہے وہ ہم سے زیادہ خستۂ تیغِ سِتم نکلیں۔ اور کچھ اس ڈر سے کہ:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مقصد سرِ دست ان خانساماؤں کا تعارف کرانا ہے جن کی دامے درمے خدمت کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے۔ اگر ہمارے لہجے میں کہیں تلخ جھلک آئے تو اسی تلخیٔ کام و دہن پر محمول کرتے ہوئے، خانساماؤں کو معاف فرمائیں۔

خانساماں سے عہدِ وفا استوار کرنے اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کا ڈھنگ کوئی مرزا عبد الودود بیگ سے سیکھے۔ یوں تو ان کی صورت ہی ایسی ہے کہ ہر کس و ناکس کا بے اختیار نصیحت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ایک دن ہم نے دیکھا کہ ان کا دیرینہ باورچی بھی ان سے اب بے تبے کر کے باتیں کر رہا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ شرفاء میں یہ اندازِ گفتگو محض مخلص دوستوں کے ساتھ روا ہے۔ جہلا سے ہمیشہ سنجیدہ گفتگو کی جاتی ہے۔ ہم نے مرزا کی توجہ اس امر کی طرف دِلائی تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے جان بوجھ کر اس کو اتنا مُنہ زور اور بد تمیز کر دیا ہے کہ اب میرے گھر کے سوا اس کی کہیں اور گزر نہیں ہو سکتی۔

کچھ دن ہوئے ایک مڈل فیل خانساماں ملازمت کی تلاش میں آ نِکلا اور آتے ہی ہمارا نام اور پیشہ پوچھا۔ پھر سابق خانساماؤں کے پتے دریافت کیے۔ نیز یہ کہ آخری خانساماں نے ملازمت کیوں چھوڑی؟ باتوں باتوں میں انہوں نے یہ عندیہ

بھی لینے کی کوشش کی کہ ہم ہفتے میں کتنی باہر مدعو ہوتے ہیں اور باورچی خانے میں چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سے ہمارے اعصاب اور اخلاق پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایک شرط انہوں نے یہ بھی لگائی اگر آپ گرمیوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر جائیں گے تو پہلے "عوضی مالک" پیش کرنا پڑے گا۔

کافی ردوکد کے بعد ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہم میں وہی خوبیاں تلاش کر رہے ہیں جو ہم ان میں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آنکھ مچولی ختم ہوئی اور کام کے اوقات کا سوال آیا تو ہم نے کہا کہ اصولاً ہمیں محنتی آدمی پسند ہیں۔ خود بیگم صاحبہ صبح پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک گھر کے کام کاج میں جٹی رہتی ہیں۔ کہنے لگے "صاحب! اُن کی بات چھوڑیئے۔ وہ گھر کی مالک ہیں۔ میں تو نوکر ہوں!" ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ برتن نہیں مانجوں گا۔ جھاڑو نہیں دوں گا۔ ایش ٹرے صاف نہیں کروں گا۔ میز نہیں لگاؤں گا۔ دعوتوں میں ہاتھ نہیں دھلاؤں گا۔

ہم نے گھبرا کر پوچھا "پھر کیا کرو گے؟"

"یہ تو آپ بتایئے۔ کام آپ کو لینا ہے۔ میں تو تابع دار ہوں۔"

جب سب باتیں حسبِ منشاء ضرورت (ضرورت ہماری، منشاء ان کی) طے ہو گئیں تو ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ بھئی سودا سلف لانے کے لیے فی الحال کوئی علیٰحدہ نوکر نہیں ہے۔ اس لیے کچھ دن تمہیں سودا بھی لانا پڑے گا۔ تنخواہ طے کر لو۔

فرمایا "جناب! تنخواہ کی فکر نہ کیجئے۔ پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ کم تنخواہ میں بھی خوش رہوں گا۔"

"پھر بھی؟"

کہنے لگے "پچھتر روپے ماہوار ہو گی۔ لیکن اگر سودا بھی مجھی کو لانا پڑا تو چالیس روپے ہو گی!"

ان کے بعد ایک ڈھنگ کا خانساماں آیا مگر بے حد دماغ دار معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اس کا پانی اُتارنے کی غرض سے پوچھا "مغلئی اور انگریزی کھانے آتے ہیں؟"

"ہر قسم کا کھانا پکا سکتا ہوں۔ حضور کا کس علاقے سے تعلق تھا؟"

ہم نے صحیح صحیح بتادیا۔ جھوم ہی تو گئے۔ کہنے لگے ”میں بھی ایک سال ادھر کاٹ چکا ہوں۔ وہاں کے باجرے کی کھچڑی کی تو دور دور دھوم ہے۔“

مزید جرح کی ہم میں تاب نہ تھی۔ لہٰذا انہوں نے اپنے آپ کو ہمارے ہاں ملازم رکھ لیا۔ دوسرے دِن پُڈنگ بناتے ہوئے انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ میں نے بارہ سال انگریزوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں، اس لیے بیٹھ کر چولہا نہیں جھونکوں گا۔ مجبوراً کھڑے ہو کر پکانے کا چولہا بنوایا۔

اُن کے بعد جو خانساماں آیا، اس نے کہا کہ میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاؤں گا۔ مگر بُرادے کی انگیٹھی پر۔ چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی۔ تیسرے کے لئے چکنی مٹی کا چولہا بنوانا پڑا۔ چوتھے کے مطالبے پر مٹی کے تیل سے جلنے والا چولہا خریدا۔ اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولھے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔

اس ظالم کا نام یاد نہیں آ رہا۔ البتہ صورت اور خدوخال اب تک یاد ہیں۔ ابتدائے ملازمت سے ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا، بلکہ پابندی سے ملباری ہوٹل میں اکڑوں بیٹھ کر دو پیسے کی چٹ پٹی دال اور ایک آنے کی تنوری روٹی کھاتا ہے۔ آخر ایک دن ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے ذرا سختی سے ٹوکا کہ ”گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟“

تنک کر بولا "صاحب! ہاتھ بیچا ہے، زبان نہیں بیچی!"

اُس نے نہایت مختصر مگر غیر مبہم الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ اگر اسے اپنے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے پر مجبور کیا گیا تو وہ فوراً استعفٰی دے دے گا۔ اس کے رویے سے ہمیں بھی شبہ ہونے لگا کہ وہ واقعی خراب کھانا پکاتا ہے۔ نیز ہم اس منطقی نتیجے پر پہنچے کہ دوزخ میں گنہگار عورتوں کو ان کے اپنے پکائے ہُوئے سالن زبردستی کھلائے جائیں گے۔ اسی طرح ریڈیو والوں کو فرشتے آتشیں گرز مار مار کر ان ہی کے نشر کئے ہوئے پروگراموں کے ریکارڈ سنائیں گے۔

ہم کھانے کے شوقین ہیں، خوشامد کے بھوکے نہیں (گو کہ اس سے انکار نہیں کہ اپنی تعریف سُن کر ہمیں بھی اپنا بنیان تنگ معلوم ہونے لگتا ہے)۔ ہم نے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ باورچی کھانا پکانے کے بجائے ہمارے گُن گاتا رہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے اپنے مرحوم اور سابق آقاؤں کا کلمہ پڑھتا رہے۔ جب کہ اِس توصیف کا اصل مقصد ہمیں جلانا اور خوبیوں کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہیں۔ اکثر اوقات بے تحاشا جی چاہتا ہے کہ کاش ہم بھی مرحوم ہوتے تاکہ ہمارا ذکر بھی اتنے ہی پیار سے ہوتا۔ بعض نہایت قابل خانساماؤں کو محض اس دور اندیشی کی بنا پر علیٰحدہ کرنا پڑا کہ آئندہ وہ

کسی اور کا نمک کھا کر ہمارے حق میں پروپیگنڈہ کرتے رہیں۔ جو شخص بھی آتا ہے یہی دعوی کرتا ہے کہ اس کے سابق آقا نے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا (یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہو گا کہ اصولی طور پر ہم خود بھی ہمیشہ دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن ریز گاری ضرور گِن لیتے ہیں)۔ ایک خانساماں نے ہمیں مطلع کیا کہ اس کا پچھلا "صاب" اس قدر شریف آدمی تھا کہ ٹھیک سے گالی تک نہیں دے سکتا تھا۔

ہم نے جل کر کہا "پھر تم نے نوکری کیوں چھوڑی؟"

تڑپ کر بولے "کون کہتا ہے کہ خدا بخش نے نوکری چھوڑی؟ قصّہ دراصل یہ ہے کہ میری پانچ مہینے کی تنخواہ چڑھ گئی تھی۔ اور اب آپ سے کیا پردہ؟ سچ تو یہ کہ ان کے گھر کا خرچ بھی میں ردّی اخبار اور بیئر کی خالی بوتلیں بیچ کر چلا رہا تھا۔ انہوں نے کبھی حساب نہیں مانگا۔ پھر انہوں نے ایک دن میری صورت دیکھ کر کہا کہ خدا بخش! تم بہت تھک گئے ہو۔ دو دِن کی چھٹی کرو اور اپنی صحت بناؤ۔ دو دِن بعد جب میں صحت بنا کر لوٹا تو گھر خالی پایا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ تمہارا صاب تو پرسوں ہی سارا سامان باندھ کر کہیں اور چلا گیا۔" یہ قصّہ سنانے کے بعد اس

نمک حلال نے ہم سے پیشگی تنخواہ مانگی تا کہ اپنے سابق آقا کے مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔

گزشتہ سال ہمارے حال پر رحم کھا کر ایک کرم فرمانے ایک تجربہ کار خانساماں بھیجا۔ جو ہر علاقے کے کھانے پکانا جانتا تھا۔ ہم نے کہا ''بھئی اور تو سب ٹھیک ہے مگر تم سات مہینے میں دس ملازمتیں چھوڑ چکے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟''

کہنے لگے ''صاب! آج کل وفادار مالک کہاں ملتا ہے؟''

اس ستم ایجاد کی بدولت بر صغیر کے ہر خطے بلکہ ہر تحصیل کے کھانے کی خوبیاں اِس ہیچمداں پنبہ وہاں کے دستر خوان پر سن سمٹ کر آ گئیں۔ مثلاً دوپہر کے کھانے پر دیکھا کہ شوربے میں مسلّم کیری ہچکولے لے رہی ہے اور سالن اس قدر ترش ہے کہ آنکھیں بند ہو جائیں اور اگر بند ہوں تو پٹ سے کھُل جائیں۔ پوچھا تو انہوں نے آگاہی بخشی کہ دکن میں رؤسا کھٹا سالن کھاتے ہیں۔ اور ہم یہ سوچتے ہی رہ گئے کہ اللہ جانے بقیہ لوگ کیا کھاتے ہوں گے۔

اسی دن شام کو ہم نے گھبرا کر پوچھا کہ دال میں پرانے جوتوں کی بو کیوں آ رہی ہے؟

جواب میں انہوں نے ایک دھواں دھار تقریر کی جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ مارواڑی سیٹھوں کے پھلنے پھُولنے اور پھیلنے کا راز ہینگ میں مضمر ہے۔

اور دوسرے دن جب ہم نے دریافت کیا کہ بندۂ خدا یہ چپاتی ہے یا دستر خوان؟

تو ہنس کر بولے کہ وطنِ مالوف میں روٹی کے حدودِ اربعہ یہی ہوتے ہیں۔

آخر کئی فاقوں کے بعد ایک دن ہم نے بہ نظرِ حوصلہ افزائی کہا:

"آج تم نے چاولوں کا اچار بہت اچھا بنایا ہے۔"

دہکتے ہوئے توے سے بیڑی سلگاتے ہوئے بولے "بندہ پروری ہے! کاٹھیاواڑی پلاؤ میں قورمے کے مسالے پڑتے ہیں!"

"خوب! مگر یہ قورمے کا مزہ تو نہیں!"

"وہاں قورمے میں اچار کا مسالہ ڈالتے ہیں!"

پھر ایک دن شام کے کھانے پر مرزا نے ناک سکیڑ کر کہا "میاں! کیا کھیر میں کھٹملوں کا بگھار دیا ہے؟"

سفید دیوار پر کوئلے سے سودے کا حساب لکھتے ہوئے حقارت سے بولے "آپ کو معلوم نہیں؟ شاہانِ اودھ لگی ہُوئی فیرنی کھاتے تھے؟"

"مگر تم نے دیکھا کیا انجام ہوا اودھ کی سلطنت کا؟"

مختصر یہ کہ ڈیڑھ مہینے تک وہ صبح و شام ہمارے ناپختہ ذوق و ذائقہ کو سنوارتا اور مشروبات و ماکولات سے وسیع المشربی کا درس دیتا رہا۔ آخر آخر میں مرزا کو شبہ ہو چلا تھا کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے جو سالن کے ذریعے صوبائی غلط فہمیاں پھیلا رہا ہے۔

اگر آپ کو کوئی کھانا بے حد مرغوب ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتا تو تازہ واردانِ بساطِ مطبخ اس مشکل کو فوراً آسان کر دیں گے۔ اشیائے خوردنی اور انسان معدے کے ساتھ بھرپور تجربے کرنے کی جو آزادی باورچیوں کو حاصل ہے وہ نِت نئی کیمیاوی ایجادات کی ضامن ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں بھنڈی بہت پسند ہے لیکن دس گھنٹے قبل یہ منکشف ہوا کہ اس نباتِ تازہ کو ایک خاص درجہ حرارت پر پانی کی مقررہ مقدار میں (جس کا علم صرف ہمارے خانساماں کو ہے) میٹھی آنچ پر پکایا جائے تو اس مرکب سے دفتروں میں لفافے اور بدلگام افسروں کے منہ ہمیشہ کے لیے بند کیے جاسکتے ہیں۔

انہی حضرت نے گزشتہ جمعرات کو سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے بچّی کو بھیجا کہ اس سے کہو کہ مہمان بیٹھے ہیں۔ اس وقت سِل کھوٹنے کی ضرورت نہیں۔

اس نے کہلا بھیجا کہ ہم ان ہی مہمانوں کی تواضع کے لیے سِل پر کبابوں کا قیمہ پیس رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کباب منہ میں رکھا تو محسوس ہوا گویا چَٹ پٹا ریگ مال کھا رہے ہیں اور ہمیں رہ رہ کر میر صاحب پر رشک آنے لگا کہ وہ مصنوعی بتیسی لگائے بے خبر بیٹھے کھا رہے تھے اور ہماری طرح کِر کِرا محسوس کر کے لال پیلے نہیں ہوئے۔ صبح تک سب کو پیچش ہو گئی۔ صرف ہمیں نہیں ہوئی۔ اور ہمیں اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم پہلے ہی اس میں مُبتلا تھے۔

یہ بات نہیں کہ خدانخواستہ ہم بیماری اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہم تو پرانی چال کے آدمی ہیں۔ اس لیے نئی زندگی سے زیادہ خوف کھاتے ہیں۔ موت برحق ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ اسے بُلانے کے لیے ہم اپنی نیک کمائی میں سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں کسی مرض ناشناس حکیم کے ہاتھوں مرنے پر بھی چنداں اعتراض نہ ہو گا۔ لیکن ہم کسی صورت خانساماں کو بالاقساط رُوح قبض کرنے کا اختیار نہیں دینا چاہتے کہ یہ صرف حکیم ڈاکٹروں کا حق ہے۔

بیماری کا ذکر چل نکلا تو اس قوی ہیکل خانساماں کا قصّہ بھی سُن لیجیے جس کو ہم سب آغا کہا کرتے تھے (آغا اس لیے کہا کرتے تھے کہ وہ سچ مچ آغا تھے)۔ ان کا خیال

آتے ہی معدے میں مہتابیاں سی جل اُٹھتی ہیں۔ تادمِ وداع ان کے کھانا پکانے، اور کھلانے کا انداز وہی رہا جو ملازمت سے پہلے ہینگ بیچنے کا ہوتا تھا۔ یعنی ڈرادھمکا کر اس کی خوبیاں منوا لیتے تھے۔ بالعموم صبح ناشتے کے بعد سو کر اٹھتے تھے۔ کچھ دن ہم نے صبح تڑکے جگانے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے نیند کی آڑ میں ہاتھا پائی کرنے کی کوشش کی تو ہم نے بھی ان کی اصلاح کا خیال ترک کر دیا۔ اس سے قطع نظر، وہ کافی تابعدار تھے۔ تابعدار سے ہماری مراد یہ ہے کہ کبھی وہ پوچھتے کہ 'چائے لاؤں؟'، اور ہم تکلفاً کہتے کہ 'جی چاہے تو لے آؤ ورنہ نہیں۔' تو کبھی واقعی لے آتے اور کبھی نہیں بھی لاتے تھے۔ جس دن سے انہوں نے باورچی خانہ سنبھالا گھر میں حکیم ڈاکٹروں کی ریل پیل ہونے لگی۔ یوں بھی ان کا پکایا ہوا کھانا دیکھ کر سر (اپنا) پیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ "اپنا" اس لیے کہ حالانکہ ہم سب ہی ان کے کھانوں سے عاجز تھے، لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کیوں کر پُرامن طریق سے رخصت کیا جائے۔ ان کو نوکر رکھنا ایسے ہی ثابت ہوا جیسے کہ شیر ببّر پر سوار ہو تو جائے لیکن اُترنے کی ہمّت نہ رکھتا ہو۔

ایک دِن ہم اسی اُدھیڑ بُن میں لیٹے ہوئے گرم پانی کی بوتل سے پیٹ سینک رہے تھے اور دوا پی پی کر اُن کو کوس رہے تھے کہ سر جھکائے آئے اور خلافِ معمول ہاتھ جوڑ کر بولے "خو! صاب! تم روز روز بیمار اوتا اے۔ اس سے امارہ

قبیلہ میں بڑا رسوائی، خُو، خانہ خراب اوتا اے" (صاحب! تم بار بار بیمار ہوتے ہو۔ اس سے ہمارے قبیلے میں ہماری رسوائی ہوتی ہے اور ہمارا خانہ خراب ہوتا ہے) اس کے بعد انہوں نے کہا سُنا معاف کرایا، اور بغیر تنخواہ لیے چل دیئے۔

ایسی ہی ایک اور دعوت کا ذکر ہے جس میں چند احباب اور افسرانِ بالا دست مدعو تھے۔ نئے خانساماں نے جو قورمہ پکایا، اس میں شوربے کا یہ عالم تھا کہ ناک پکڑ کے غوطے لگائیں تو شاید کوئی بوٹی ہاتھ آجائے۔ اِکا دُکا کہیں نظر آ بھی جاتی تو کچھ اس طرح کہ:

صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں

اور یہ بسا غنیمت تھا کیوں کہ مہمان کے منہ میں پہنچنے کے بعد، غالب کے الفاظ میں، یہ کیفیت تھی کہ:

کھینچتا ہے جس قدر اتنی ہی کھنچتی جائے ہے!

دورانِ ضیافت احباب نے بکمال سنجیدگی مشورہ دیا کہ "ریفریجریٹر خرید لو۔ روز روز کی جھک جھک سے نجات مل جائی گی۔ بس ایک دن لذیذ کھانا پکوالو۔ اور ہفتے بھر ٹھاٹ سے کھاؤ اور کِھلاؤ۔"

قسطوں پر ریفریجریٹر خریدنے کے بعد ہمیں واقعی بڑا فرق محسوس ہوا۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ پہلے جو بدمزہ کھانا صرف ایک ہی وقت کھاتے تھے، اب اسے ہفتے بھر کھانا پڑتا ہے۔

ہم نے اس عذابِ مسلسل کی شکایت کی تو وہی احباب تلقین فرمانے لگے کہ

”جب خرچ کیا ہے صبر بھی کر، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔“

کل پھر مرزا سے اپنی گوناگوں مشکلات کا ذکر کیا تو کہنے لگے:

”یہ الجھنیں آپ نے اپنے چٹورپن سے خواہ مخواہ پیدا کر رکھی ہیں۔ ورنہ سادہ غذا اور اعلیٰ خیالات سے یہ مسئلہ کبھی کا خود بخود حل ہو گیا ہوتا۔ یہی آئینِ قدرت ہے اور یہی آزاد تہذیب کی اساس بھی! آپ نے مولوی اسماعیل میرٹھی کا وہ پاکیزہ شعر نہیں پڑھا؟

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر

تو وہ خوف وذِلّت کے حلوے سے بہتر“

عرض کیا ”مجھے کسی کے آزاد رہنے پر، خواہ شاعر ہی کیوں نہ ہو، کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس شعر پر مجھے عرصہ سے یہ اعتراض ہے کہ اس میں آزادی سے

زیادہ خشک روٹی کی تعریف کی گئی ہے۔ ممکن ہے عمدہ غذا اعلیٰ تہذیب کو جنم نہ دے سکے، لیکن اعلیٰ تہذیب کبھی خراب غذا برداشت نہیں کر سکتی۔"

فرمایا "برداشت کی ایک ہی رہی! خراب کھانا کھا کر بدمزہ نہ ہونا، یہی شرافت کی دلیل ہے۔"

گزارش کی "مردانگی تو یہ کہ آدمی عرصہ تک عمدہ غذا کھائے اور شرافت کے جامے سے باہر نہ ہو!"

مشتعل ہو گئے "بجا! لیکن یہ کہاں کی شرافت ہے کہ آدمی اُٹھتے بیٹھتے کھانے کا ذکر کرتا رہے۔ برا نہ مانئے گا۔ آپ کے بعض مضامین کسی بگڑے ہوئے شاہی رکابدار کی خاندانی بیاض معلوم ہوتے ہیں۔ جبھی تو کم پڑھی لکھی عورتیں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔"

ہم نے ٹوکا "آپ بھول رہے ہیں کہ فرانس میں کھانا کھانے اور پکانے کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔"

وہ بِگڑ گئے "مگر آپ نے اسے جنونِ لطیفہ کا درجہ دے رکھا ہے۔ اگر آپ واقعی اپنی بے قصور قوم کی اصلاح کے درپے ہیں تو کوئی کام کی بات کیجئے اور ترقّی کی راہیں سجھائیے۔"

مزہ لینے کی خاطر چھیڑا "ایک دفعہ قوم کو اچھا پہننے اور کھانے کا چسکا لگ تو ترقّی کی راہیں خود بخود سوجھ جائیں گی۔ گاندھی جی کا قول ہے کہ جس دیس میں لاکھوں آدمیوں کو دو وقت کا کھانا نصیب نہ ہوتا ہو، وہاں بھگوان کی بھی ہمت نہیں ہوتی کہ اَن داتا کے سوا کسی اور روپ میں سامنے آسکے۔ بھوکے کے لیے بھوجن ہی بھگوان کا اوتار ہے۔۔۔۔۔"

قطع کلامی کی معافی مانگے بغیر بولے "مگر وہ تو بکری کا دودھ اور کھجور کھاتے تھے۔ اور آپ فنِ غذا شناسی کو فلسفۂ خدا شناسی سمجھ بیٹھے ہیں۔ خود آپ کے محبوب یونانی فلسفی جو بھرپور زندگی کے قائل تھے، دماغ سے محسوس کرتے اور دل سے سوچتے تھے۔ مگر آپ تو معدے سے سوچتے ہیں۔ اور دیکھا جائے تو آپ آج بھی وہی مشورہ دے رہے ہیں جو ملکہ میری انطونیت نے دیا تھا۔ ایک درباری نے جب اس کے گوش گزار کیا کہ روٹی نہ ملنے کے سبب ہزاروں انسان پیرس کی گلیوں میں دم توڑ رہے ہیں تو اس نے حیرت سے پوچھا کہ یہ احمق کیک کیوں نہیں کھاتے؟"

چارپائی اور کلچر

ایک فرانسیسی مفکّر کہتا ہے کہ موسیقی میں مجھے جو بات پسند ہے وہ دراصل وہ حسین خواتین ہیں جو اپنی ننھی ننھی ہتھیلیوں پر ٹھوڑیاں رکھ کر اُسے سُنتی ہیں۔ یہ قول میں نے اپنی بریّت میں اس لئے نقل نہیں کیا کہ میں جو قوّالی سے بیزار ہوں تو اس کی اصل وجہ وہ بزرگ ہیں جو محفلِ سماع کو رونق بخشتے ہیں۔ اور نہ میرا یہ دعویٰ کہ میں نے پیانو اور پلنگ کے درمیان کوئی ثقافتی رشتہ دریافت کر لیا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ پہلی بار بان کی کھری چارپائی کی چرچراہٹ اور ادوان کا تناؤ دیکھ کر بعض نووارد سیاح اسے سارنگی کے قبیل کا ایشیائی ساز سمجھتے ہیں۔ کہنا یہ تھا کہ میرے نزدیک چارپائی کی دِلکشی کا سبب وہ خوش باش لوگ ہیں جو اس پر اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے شخصی اور قومی مزاج کے پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے کہ کسی شخص کی شائستگی و شرافت کا اندازہ آپ صرف اس سے لگا سکتے ہیں کہ وہ فرصت کے لمحات میں کیا کرتا ہے اور رات کو کِس قسِم کے خواب دیکھتا ہے۔

چارپائی ایک ایسی خود کفیل تہذیب کی آخری نشانی ہے جو نئے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ براہونے کے لیے نِت نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قائل نہ تھی۔ بلکہ ایسے نازک مواقع پر پُرانی چیزوں میں نئی خوبیاں دریافت کر کے مُسکرادیتی تھی۔ اس عہد کی رنگارنگ مجلسی زندگی کا تصوّر چارپائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی ذہن کے افق پر بہت سے سہانے منظر اُبھر آتے ہیں۔اُجلی اُجلی ٹھنڈی چادریں، خس کے پنکھے، کچّی مٹّی کی سَن سَن کرتی کوری صُراحیاں، چھڑکاؤ سے بھیگی زمین کی سوندھی سوندھی لپٹ اور آم کے لدے پھندے درخت جن میں آموں کے بجائے لڑکے لٹکے رہتے ہیں۔ اور اُن کی چھاؤں میں جوان جسم کی طرح کسی کسائی ایک چارپائی جس پر دِن بھر شطرنج کی بساط یا رمی کی پھڑ جمی اور جو شام کو دستر خوان بچھا کر کھانے کی میز بنالی گئی۔ ذرا غور سے دیکھئے تو یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سگھڑ بیویاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔ اسی چارپائی کو وقتِ ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر اسٹریچر بنالیتے ہیں اور بجوگ پڑ جائے تو انہیں بانسوں سے ایک دُوسرے کو اسٹریچر کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیمار دار مؤخر الذّکر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کر کے اوّل الذِّکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔ اور جب ساون میں

اُودی اُودی گھٹائیں اُٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں۔ اسی پر بیٹھ کر مولوی صاحب قمچی کے ذریعہ اخلاقیات کے بنیادی اُصول ذہن نشین کراتے ہیں۔ اسی پر نو مولود بچّے غاؤں غاؤں کرتی، چُندھیائی ہُوئی آنکھیں کھول کر اپنے والدین کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں اور اسی پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ بعض حضرات اس مضمون کو چارپائی کا پرچہ ترکیبِ استعمال سمجھ لیں گے تو اس ضمن میں کچھ اور تفصیلات پیش کرتا۔ لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکا ہُوں، یہ مضمون اس تہذیبی علامت کا قصیدہ نہیں، مرثیہ ہے۔ تاہم بہ نظرِ احتیاط اِتنی وضاحت ضروری ہے کہ:

ہم اس نعمت کے مُنکر ہیں نہ عادی

نام کی مناسبت سے پائے اگر چار ہوں تو مناسب ہے ورنہ اس سے کم ہوں، تب بھی خلقِ خدا کے کام بند نہیں ہوتے۔ اسی طرح پایوں کے حجم اور شکل کی بھی تخصیص نہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر آپ غبی سے غبی لڑکے کو اقلیدس کی تمام شکلیں سمجھا سکتے ہیں۔ اور اس مہم کو سَر کرنے کے بعد آپ کو احساس ہو گا کہ ابھی کچھ شکلیں ایسی رہ گئی ہیں جن کا صرف اقلیدس بلکہ تجریدی مصوّری میں

بھی کوئی ذکر نہیں۔ دیہات میں ایسے پائے بہت عام ہیں جو آدھے پٹیوں سے نیچے اور آدھے اُوپر نکلے ہوتے ہیں۔ ایسی چارپائی کا اُلٹا سیدھا دریافت کرنے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ جس طرف بان صاف ہو وہ ہمیشہ "اُلٹا" ہو گا۔ راقم الحروف نے ایسے اَن گھڑ پائے دیکھے ہیں جن کی ساخت میں بڑھئی نے محض یہ اصول مدِّ نظر رکھا ہو گا کہ بسولہ چلائے بغیر پیڑ کو اپنی قدرتی حالت میں جوں کا تُوں پٹیوں سے وصل کر دیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہماری نظر سے خراد کے بنے ایسے سڈول پائے بھی گزرے ہیں جنہیں چوڑی دار پاجامہ پہنانے کو جی چاہتا ہے۔ اس قسم کے پایوں سے منٹو مرحوم کو جو والہانہ عِشق رہا ہو گا اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک دوست سے ایک میم کی حسین ٹانگیں دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں کیا۔ کہنے لگے:

"اگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مِل جائیں تو انہیں کٹوا کر اپنے پلنگ کے پائے بنوا لوں۔"

غور کیجئے تو مباحثے اور مناظرے کے لیے چارپائی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ فریقین آمنے سامنے نہیں بلکہ عموماً اپنے حریف کی پیٹھ کا سہارا لے کر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ اور بحث و تکرار کے لیے اِس سے بہتر طرزِ

نشست ممکن نہیں، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ اِسی بنا پر میرا عرصے سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔ آپ نے خود دیکھا ہو گا کہ لدی پھندی چارپائیوں پر لوگ پیٹ بھر کے اپنوں کی غیبت کرتے ہیں مگر دِل بُرے نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ سبھی جانتے ہیں کہ غیبت اسی کی ہوتی ہے جِسے اپنا سمجھتے ہیں۔ اور کچھ یوں بھی ہے کہ ہمارے ہاں غیبت سے مقصود قطعِ محبّت ہے نہ گزارشِ احوالِ واقعی بلکہ محفل میں

لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

لوگ گھنٹوں چارپائی پر کسمساتے رہتے ہیں مگر کوئی اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ اس لیے کہ ہر شخص اپنی جگہ بخوبی جانتا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو فوراً اس کی غیبت شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ پچھلے پہر تک مرد ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بحث کرتے ہیں اور عورتیں گال سے گال بھِڑائے کَچر کَچر لڑتی رہتی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مرد پہلے بحث کرتے ہیں، پھر لڑتے ہیں۔ عورتیں پہلے لڑتی ہیں اور بعد میں

بحث کرتی ہیں۔ مجھے ثانی الذّکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایک چارپائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گزارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا نہیں دیکھا۔ لیکن اس نوع کے نظریاتی مسائل میں اعداد و شمار پر بے جا زور دینے سے بعض اوقات عجیب و غریب نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ آپ نے ضرور سُنا ہو گا کہ جس وقت مسلمانوں نے اُندلس فتح کیا تو وہاں کے بڑے گرجا میں چوٹی کے مسیحی علما و فقہا اس مسئلہ پر کمال سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔

ہم تو اِتنا جانتے ہیں کہ تنگ سے تنگ چارپائی پر بھی لوگ ایک دوسرے کی طرف پاؤں کیے اًاِ کی شکل میں سوتے رہتے ہیں۔ چنچل ناری کا چیتے جیسا اَجیت بدن ہو یا کسی عمر رسیدہ کی کمان جیسی خمیدہ کمر- یہ اپنے آپ کو ہر قالب کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اس میں بڑی وسعت ہے بلکہ اتنی لچک بھی ہے کہ آپ جس آسن چاہیں بیٹھ اور لیٹ جائیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ بیٹھنے اور لیٹنے کی درمیانی صورتیں ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہیں ان کے لیے

یہ خاص طور پر موزوں ہے۔ یورپین فرنیچر سے مجھے کوئی چڑ نہیں، لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ایشیائی مزاج نیم خیزی اور نیم درازی کے جن زاویوں اور آسائشوں کا عادی ہو چکا ہے، وہ اس میں میسر نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر صوفے پر ہم اکڑوں نہیں بیٹھ سکتے۔ کوچ پر دستر خوان نہیں بچھا سکتے۔ اسٹول پر قیلولہ نہیں کر سکتے۔ اور کرسی پر، بقول اخلاق احمد، اُردُو میں نہیں بیٹھ سکتے۔

ایشیا نے دنیا کو دو نعمتوں سے روشناس کیا۔ چائے اور چارپائی! اور ان میں یہ خاصیت مُشترک ہے کہ دونوں سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔ اگر گرمی میں لوگ کھری چارپائی پر سوار رہتے ہیں تو برسات میں یہ لوگوں پر سوار رہتی ہے اور کھلے میں سونے کے رسیا اسے اندھیری راتوں میں برآمدے سے صحن اور صحن سے برآمدے میں سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ پھر مہاوٹ میں سردی اور بان سے بچاؤ کے لیے لحاف اور توشک نکالتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ سردی رُوئی سے جاتی ہے یا دُوئی سے۔ لیکن اگر یہ اسباب ناپید ہوں اور سردی زیادہ اور لحاف پتلا ہو تو غریب غربا محض منٹو کے افسانے پڑھ کر سو رہتے ہیں۔

عربی میں اُونٹ کے اِتنے نام ہیں کہ دُور اندیش مولوی اپنے ہونہار شاگردوں کو پاس ہونے کا یہ گُر بتاتے ہیں کہ اگر کِسی مشکل یا کڈھب لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں تو سمجھ لو کہ اس سے اُونٹ مُراد ہے۔ اسی طرح اُردُو میں چارپائی کی جتنی قسمیں ہیں اس کی مثال اور کِسی ترقی یافتہ زبان میں شاید ہی مِل سکیں:-

کھاٹ، کھٹّا، کھٹیا، کھٹولا، اُڑن کھٹولا، کھٹولی، کھٹ، چھپر کھٹ، کھرا، کھری، جھلگا، پلنگ، پلنگڑی، ماچ، ماچی، ماچا، چارپائی، نواری، مسہری، منجی۔

یہ نامکمل سی فہرست صرف اُردُو کی وسعت ہی نہیں بلکہ چارپائی کی ہمہ گیری پر دال ہے اور ہمارے تمدّن میں اس کا مقام و مرتبہ متعیّن کرتی ہے۔

لیکن چارپائی کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے بیچ کھُچے اور ٹوٹے ادھڑے بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے محض اپنی قوّتِ ایمان کے زور سے اٹکے رہتے ہیں۔ اس قسم کے جھلنگے کو بچّے بطور جھولا اور بڑے بوڑھے آلۂ تزکیۂ نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چارپائیوں کو غریب رشتے داروں کی طرح کونوں کھدروں میں آڑے وقت کے لیے چھُپا کر رکھا جاتا ہے۔ خود مجھے مرزا عبدالودود بیگ کے ہاں ایک رات ایسی ہی چارپائی پر گزارنے کا اتّفاق ہوا جس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نون غنہ (ں) بن جاتا ہے۔

اس میں داخل ہو کر میں ابھی اپنے اعمال کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ یکایک اندھیرا ہو گیا، جس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ ایک دُوسرا ملازم اوپر ایک دری اور بچھا گیا۔ اس خوف سے کہ دوسری منزل پر کوئی اور سواری نہ آ جائے، میں نے سر سے دری پھینک کر اُٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے بڑھ کے پیشانی کی بلائیں لینے لگے۔ کھڑبڑ سُن کر مرزا خود آئے اور چیخ کر پوچھنے لگے بھائی آپ ہیں کہاں؟ میں نے مختصراً اپنے محلِّ وقوع سے آگاہ کیا تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ انہیں کافی زور لگانا پڑا اس لیے کہ میرا سر اور پاؤں بانوں میں بری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور بان سر سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ بمشکل تمام اُنہوں نے مجھے کھڑا کیا۔

اور میرے ساتھ ہی، مجھ سے کچھ پہلے، چارپائی بھی کھڑی ہو گئی!

کہنے لگے ”کیا بات ہے؟ آپ کچھ بے قرار سے ہیں۔ معدے کا فعل درست نہیں معلوم ہوتا۔“

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دوڑ کر اپنا تیار کردہ چُورن لے آئے اور اپنے ہاتھ سے میرے مُنہ میں ڈالا۔ پھنکی مُنہ میں بھر کر شکریہ کے دو چار لفظ ہی کہنے پایا ہوں گا کہ معاً نظر اُن کے مظلوم منہ پر پڑ گئی جو حیرت سے کھلا ہُوا تھا۔ میں

بہت نادم ہوا۔ لیکن قبل اس کے کہ کچھ اور کہوں انہوں نے اپنا ہاتھ میرے مُنہ پر رکھ دیا۔ پھر مجھے آرام کرنے کی تلقین کر کے منہ دھونے چلے گئے۔

میں یہ چارپائی اوڑھے لیٹا تھا کہ اُن کی منجھلی بچّی آ نکلی۔ تتلا کر پوچھنے لگی:

"چچا جان! اکڑوں کیوں بیٹھے ہیں؟"

بعد ازاں سب بچّے مِل کر اندھا بھینسا کھیلنے لگے۔ بالآخر اُن کی امی کو مداخلت کرنا پڑی۔

"کم بختو! اب تو چُپ ہو جاؤ! کیا گھر کو بھی اسکول سمجھ رکھا ہے؟"

چند منٹ بعد کسی شیر خوار کے دھاڑنے کی آواز آئی مگر جلد ہی یہ چیخیں مرزا کی لوریوں میں دَب گئیں جن میں ڈانٹ ڈانٹ کر نیند کو آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ چند لمحوں بعد مرزا اپنے نقشِ فریادی کو سینہ سے چمٹائے میرے پاس آئے اور انتہائی لجاجت آمیز لہجے میں بولے:

"معاف کیجئے! آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ مگر مُنّو میاں آپ کی چارپائی کے لیے ضد کر رہے ہیں۔ انہیں دوسری چارپائی پر نیند نہیں آتی۔ آپ میری چارپائی پر سو جایئے، میں اپنی فولڈنگ چارپائی پر پڑ رہوں گا۔"

میں نے بخوشی مُنّو میاں کا حق مُنّو میاں کو سونپ دیا اور جب اس میں جھولتے جھولتے اُن کی آنکھ لگ گئی تو ان کے والدِ بزرگوار کی زبان تالو سے لگی۔

اب سُنئے مجھ پر کیا گزری۔ مرزا خود تو فولڈنگ چارپائی پر چلے گئے مگر جس چارپائی پر مجھ کو بطورِ خاص منتقل کیا گیا۔ اس کا نقشہ یہ تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں احتیاط سے تہ کر کے بالترتیب سینہ اور پیٹ پر رکھنی پڑیں۔ اس شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے یوں دو چشمی ھ بنا، یونانی میزبان پروقراط کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے پاس دو چارپائیاں تھیں۔ ایک لمبی اور دوسری چھوٹی۔ ٹھنگنے مہمان کو وہ لمبی چارپائی پر سُلاتا اور کھینچ تان کر اس کا جسم چارپائی کے برابر کر دیتا۔ اس کے برعکس لمبے آدمی کو وہ چھوٹی چارپائی دیتا اور جسم کے زائد حصّوں کو کانٹ چھانٹ کر ابدی نیند سُلا دیتا۔

اس کے حُدود اربعہ کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ انگڑائی لینے کے لیے مجھے تین چار مرتبہ نیچے کودنا پڑا۔ کودنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اس کی اونچائی "درمیانہ" تھی۔ یہاں درمیانہ سے ہماری مراد وہ پست بلندی یا موزوں سطحِ مرتفع ہی، جس کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو کہ:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

گو کہ ظاہر بین نگاہ کو یہ متوازی الاضلاع نظر آتی تھی مگر مرزا نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ بارش سے پیشتر یہ مستطیل تھی۔ البتہ بارش میں بھیگنے کے سبب جو کان آگئی تھی، اس سے مجھے کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ مرزا نے ازراہِ تکلّف ایک پائے کے نیچے ڈکشنری اور دوسرے کے نیچے میرا نیا جوتا رکھ کر سطح درست کر دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تہذیب کے جس نازک دور میں غیور مرد چارپائی پر دم توڑنے کی بجائے جنگ میں دشمن کے ہاتھوں بے گور وکفن مرنا پسند کرتے تھے، اسی قسم کی مردم آزار چارپائیوں کا رواج ہو گا۔ لیکن اب جب دشمن سیانے اور چارپائیاں زیادہ آرام دہ ہو گئے ہیں، مرنے کے اور بھی معقول اور باعزّت طریقے دریافت ہو گئے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ہاں ایک اوسط درجہ کے آدمی کی دو تہائی زندگی چارپائی پر گزرتی ہے۔ اور بقیہ اس کی آرزو میں! بالخصوص عورتوں کی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے جو بساطِ محفل بھی ہے اور مونسِ تنہائی بھی۔ اس کے سہارے وہ تمام مصائب انگیز کر لیتی ہیں۔ خیر مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں مگر عورتیں اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں کہ انہیں مصائب کے علاوہ مَردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ مئی جون کی جھلسا دینے والی دوپہر میں کنواریاں بالیاں چارپائی کے نیچے ہنڈیا کلھیا

پکاتی ہیں اور اوپر بڑی بوڑھیاں بیٹھے ہوئے دِنوں کو یاد کر کے ایک دوسرے کا لہو گرماتی رہتی ہیں (قاعدہ ہے کہ جیسے جیسے حافظہ کمزور ہوتا جاتا ہے، ماضی اور بھی سہانا معلوم ہوتا ہے!) اسی پر بوڑھی ساس تسبیح کے دانوں پر صبح و شام اپنے پوتوں اور نواسوں کو گنتی رہتی ہے اور گڑ گڑا گڑ گڑا کر دُعا مانگتی ہے کہ خُدا اس کا سایہ بہُو کے سر پر رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ خیر سے بہری بھی ہے۔ اس لیے بہو اگر سانس لینے کے لیے بھی منہ کھولے تو گمان ہوتا ہے کہ مجھے کوس رہی ہو گی۔ قدیم داستانوں کی رُوٹھی رانی اسی پر اپنے جوڑے کا تکیہ بنائے اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑتی تھی اور آج بھی سہاگنیں اسی کی اوٹ میں اُدوان میں سے ہاتھ نکال کر پانچ انگلی کی کلائی میں تین انگلی کی چوڑیاں پہنتی اور گشتی نجومیوں کو ہاتھ دکھا کر اپنے بچوں اور سوکنوں کی تعداد پوچھتی ہیں۔ لیکن جن بھاگوانوں کی گود بھری ہو، اُن کے بھرے پرے گھر میں آپ کو چارپائی پر پوتڑے اور سویّاں ساتھ ساتھ سوکھتی نظر آئیں گی۔ گھٹنیوں چلتے بچّے اسی کی پٹی پکڑ کر مَیّوں مَیّوں چلنا سیکھتے ہیں اور رات برات پائنتی سے قدمچوں کا کام لیتے ہیں۔ لیکن جب ذرا سمجھ آ جاتی ہے تو اسی چارپائی پر صاف سُتھرے تکیوں سے لڑتے ہیں۔ نامور پہلوانوں کے بچپن کی چھان بین کی جائے تو پتہ چلے گا کہ انہوں نے قینچی اور دھوبی پاٹ جیسے خطرناک داؤ اسی محفوظ اکھاڑے میں سیکھے۔

جس زمانے میں وزن کرنے کی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی تو شائستہ عورتیں چوڑیوں کے تنگ ہونے اور مرد چارپائی کے بان کے دباؤ سے دوسرے کے وزن کا تخمینہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں چارپائی صرف میزان جسم ہی نہیں بلکہ معیارِ اعمال بھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جنازے کو کندھا دینے والے چارپائی کے وزن کی بنا پر مرحوم کے جنتی یا اس کے برعکس ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہمارے ہاں دُبلے آدمی کی دنیا اور موٹے کی عاقبت عام طور خراب ہوتی ہے۔

برِّصغیر میں چند علاقے ایسے بھی ہیں جہاں اگر چارپائی کو آسمان کی طرف پائنتی کر کے کھڑا کر دیا جائے تو ہمسائے تعزیت کو آنے لگتے ہیں۔ سوگ کی یہ علامت بہت پرانی ہے گو کہ دیگر علاقوں میں یہ عمودی (ا) نہیں، افقی (-) ہوتی ہے۔ اب بھی گُنجان محلّوں میں عورتیں اسی عام فہم استعارے کا سہارا لے کر کوستی سُنائی دیں گی۔ ”الٰہی! تن تن کوڑھ ٹپکے۔ مچمچاتی ہوئی کھاٹ نکلے!“ دوسرا بھرپور جملہ بددُعا ہی نہیں بلکہ وقتِ ضرورت نہایت جامع ومانع سوانح عمری کا کام بھی دے سکتا ہے کیونکہ اس میں مرحومہ کی عمر، نامُرادی، وزن اور ڈیل ڈول کے متعلق نہایت بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ نیز اس بات کی سند ملتی ہے کہ راہی مُلکِ

عدم نے وہی کم خرچ بالا نشین وسیلہ نقل و حمل اختیار کیا جس کی جانب میر اشارہ کر چکے ہیں:

تیری گلی میں سدا اے کشندہ عالم

ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں

قدرت نے اپنی رحمت سے صفائی کا کچھ ایسا انتظام رکھا ہے کہ ہر ایک چارپائی کو سال میں کم از کم دو مرتبہ کھولتے پانی سے دھارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو نفاست پسند حضرات جان لینے کا یہ طریقہ جائز نہیں سمجھتے وہ چارپائی کو اُلٹا کر کے چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر دن بھر گھر والے کھٹمل اور محلے والے عِبرت پکڑتے ہیں۔ اہلِ نظر چارپائی کی چُولوں میں رہنے والی مخلوق کی جسامت اور رنگت پر ہی سونے والوں کی صحت اور حسب نسب کا قیاس کرتے ہیں (واضح رہے کہ یورپ میں گھوڑوں اور کتّوں کے سوا، کوئی کسی کا حسب نسب نہیں پوچھتا) اُلٹی چارپائی کو قرنطینہ کی علامت جان کر راہ گیر راستہ بدل دیں تو تعجب نہیں۔ حد یہ کہ فقیر بھی ایسے گھروں کے سامنے صدا لگانا بند کر دیتے ہیں۔

چارپائی سے پراسرار آوازیں نِکلتی ہیں، ان کا مرکز دریافت کرنا اتنا ہی دُشوار ہے جتنا کہ برسات کی اندھیری رات میں کھوج لگانا کہ مینڈک کے ٹرّانے کی آواز کِدھر سے آئی یا کہ یہ تشخیص کرنا کہ آدھی رات کو بِلبِلاتے ہُوئے شِیر خوار بچّے کے درد کہاں اُٹھ رہا ہے۔ چرِ چرِاتی ہوئی چارپائی کو میں نہ گلِ نغمہ سمجھتا ہوں، نہ پردۂ ساز، اور نہ اپنی شکست کی آواز! درحقیقت یہ آواز چارپائی کا اعلانِ صحت ہے کیونکہ اس کے ٹوٹتے ہی یہ بند ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک خودکار الارم کی حیثیت سے یہ شب بیداری اور سحر خیزی میں مدد دیتی ہے۔ بعض چارپائیاں اس قدر چغل خور ہوتی ہیں کہ ذرا کروٹ بدلیں تو دوسری چارپائی والا کلمہ پڑھتا ہوا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اگر پاؤں بھی سکیڑیں تو کتّے اتنے زور سے بھونکتے ہیں کہ چوکیدار تک جاگ اُٹھتے ہیں۔ اس یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگ رات بھر نہ صرف ایک دوسرے کی جان ومال بلکہ چال چلن کی بھی چوکیداری کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ ہی بتایئے کہ رات کو آنکھ کھُلتے ہی نظر سب سے پہلے پاس والی چارپائی پر کیوں جاتی ہے۔

اور آنا گھر میں مُرغیوں کا

عرض کیا۔ "کچھ بھی ہو۔ میں گھر میں مرغیاں پالنے کا روادار نہیں۔ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ ان کا صحیح مقام پیٹ اور پلیٹ ہے اور شاید۔۔۔۔"

"اس راسخ عقیدے میں میری طرف سے پتیلی کا اور اضافہ کر لیجیے۔" انہوں نے بات کاٹی۔

پھر عرض کیا۔ "اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مُرغی عمرِ طبعی کو نہیں پہنچ پاتی۔ آپ نے خود دیکھا ہو گا کہ ہماری ضیافتوں میں میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ مرغیوں اور مہمانوں کی تعداد اور ان کے تناسب سے لگایا جاتا ہے۔"

فرمایا۔ "یہ صحیح ہے کہ انسان روٹی پر ہی زندہ نہیں رہتا۔ اسے مُرغِ مسلّم کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ خدا نے مرغی کو محض انسان کے کھانے کے لیے پیدا کیا تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ صاحب! مرغی تو

در کنار۔ میں تو انڈے کو بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ تازے خود کھائیے۔ گندے ہو جائیں تو ہوٹلوں اور سیاسی جلسوں کے لیے دُگنے داموں بیچیئے۔ یوں تو اس میں، میرا مطلب ہے تازے انڈے میں:

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

مگر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پھوہڑ سے پھوہڑ عورت کسی طرح بھی پکائے یقیناً مزے دار پکے گا۔ آملیٹ، نیم برشت، تلا ہوا، خاگینہ، حلوا۔۔۔"

اس کے بعد انہوں نے ایک نہایت پیچیدہ اور گنجلک تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ آملیٹ اور خاگینہ وغیرہ بگاڑنے کے لیے غیر معمولی سلیقہ اور صلاحیت درکار ہے جو فی زمانہ مفقود ہے۔

اختلاف کی گنجائش نظر نہ آئی تو میں نے پہلو بچا کر وار کیا۔ "یہ سب درست! لیکن اگر مُرغیاں کھانے پر اُتر آئیں تو ایک ہی ماہ میں ڈربے کے ڈربے صاف ہو جائیں گے۔"

کہنے لگے۔ "یہ نسل مٹائے نہیں مٹتی۔ جہاں تک اس جنس کا تعلق ہے دو اور دو چار نہیں بلکہ چالیس ہوتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو خود حساب کر کے دیکھ لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ دس مرغیوں سے مرغبانی کی ابتدا کرتے ہیں۔ ایک اعلیٰ نسل

کی مرغی سال میں اوسطاً دو سو سے ڈھائی سو تک انڈے دیتی ہے۔ لیکن آپ چونکہ فطرتاً قنوطی واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ مانے لیتے ہیں کہ آپ کی مرغی ڈیڑھ سو انڈے دے گی۔"

میں نے ٹوکا۔ "مگر میری قنوطیت کا مرغی کی انڈے دینے کی صلاحیت سے کیا تعلق؟"

بولے۔ "بھئی آپ تو قدم قدم پر اُلجھتے ہیں۔ قنوطی سے ایسا شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں رونے کے لیے بنائی ہیں۔ خیر۔ اس کو جانے دیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حساب سے پہلے سال میں ڈیڑھ ہزار انڈے ہوں گے اور دوسرے سال ان انڈوں سے جو مرغیاں نکلیں گی وہ دو لاکھ پچیس ہزار انڈے دیں گی۔ جن سے تیسرے سال اسی محتاط اندازے کے مطابق، تین کروڑ سینتیس لاکھ پچاس ہزار چوزے نکلیں گے۔ بالکل سیدھا سا حساب ہے۔"

"مگر یہ سب کھائیں گے کیا۔" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

ارشاد ہوا۔ ”مرغ اور مُلّا کے رزق کی فکر تو اللہ میاں کو بھی نہیں ہوتی۔ اس کی خوبی یہی ہے کہ اپنا رزق آپ تلاش کرتا ہے۔ آپ پال کر تو دیکھئے۔ دانہ دُنکا، کیڑے مکوڑے، کنکر، پتھر چُگ کر اپنا پیٹ بھر لیں گے۔“

پوچھا۔ ”اگر مرغیاں پالنا اس قدر آسان و نفع بخش ہے تو آپ اپنی مرغیاں مجھے کیوں دینا چاہتے ہیں۔“

فرمایا۔ ”یہ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔ ناحق ردوقدح کی۔ آپ جانتے ہیں میرا مکان پہلے ہی کس قدر مختصر ہے۔ آدھے میں ہم رہتے ہیں اور آدھے میں مرغیاں۔ اب مشکل یہ آ پڑی ہے کہ کل کچھ سُسرالی عزیز چھٹیاں گزارنے آ رہے ہیں۔ اس لیے۔۔۔“

اور دوسرے دن ان کے نصف مکان میں سُسرالی عزیز اور ہمارے گھر میں مرغیاں آ گئیں۔

اب اس کو میری سادہ لوحی کہیے یا خلوصِ نیت کہ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ انسان محبّت کا بھوکا ہے اور جانور اس واسطے پالتا ہے کہ اپنے مالک کو پہچاننے اور اس کا حکم بجالائے۔ گھوڑا اپنے سوار کا آسن اور ہاتھی اپنے مہاوت کا آنکس پہچانتا ہے۔ کُتّا اپنے مالک کو دیکھتے ہی دُم ہلانے لگتا ہے۔ جس سے مالک کو روحانی خوشی

ہوتی ہے۔ سانپ بھی سپیرے سے ہِل جاتا ہے۔ لیکن مرغیاں! میں نے آج تک کوئی مرغی ایسی نہیں دیکھی جو مرغ کے سوا کسی اور کو پہچانے اور نہ ایسا مرغ نظر سے گزرا جس کو اپنے پرائے کی تمیز ہو۔ مہینوں ان کی برداشت اور سنبھال کیجیے۔ برسوں ہتھیلیوں پر چگائیے۔ لیکن کیا مجال کہ آپ سے ذرا بھی مانوس ہو جائیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ میرے دہلیز پر قدم رکھتے ہی مرغ سرکس کے طوطے کی مانند توپ چلا کر سلامی دیں گے، یا چوزے میرے پاؤں میں وفادار کُتّے کی طرح لوٹیں گے، اور مرغیاں اپنے اپنے انڈے "سپردم بتو مایۂ خویش را" کہتی ہوئی مجھے سونپ کر الٹے قدموں واپس چلی جائیں گی۔ تاہم پالتو جانور سے خواہ وہ شرعاً حلال ہی کیوں نہ ہو یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ہر چمکتی چیز کو چھُری سمجھ کر بِدکنے لگے۔ اور مہینوں کی پرورش و پرداخت کے باوجود محض اپنے جبلّی تعصب کی بنا پر ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا تصور کرے۔

انہیں مانوس کرنے کے خیال سے بچّوں نے ہر ایک مُرغ کا علیٰحدہ نام رکھ چھوڑا تھا۔ اکثر کے نام سابق لیڈروں اور خاندان کے بزرگوں پر رکھے گئے۔ گو ان بزرگوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا مگر ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ کا کہنا تھا کہ یہ بیچارے مرغوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ لیکن ان ناموں

کے باوصف مجھے ایک ہی نسل کے مرغوں میں آج تک کوئی ایسی خصوصیت نظر نہ آئی جو ایک مرغ کو دُوسرے سے ممیز کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے سب مرغ، نوزائیدہ بچے اور سِکھ ایک جیسی شکل کے نظر آتے ہیں۔ اور انہیں دیکھ کر اپنی بینائی اور حافظے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی شناخت اور تشخیص کے لیے خاص مہارت و ملکہ درکار ہو۔ جس کی خود میں تاب نہ پا کر اپنے حواسِ خمسہ سے مایوس ہو جاتا ہوں۔

ایک عام خوش فہمی جس میں تعلیم یافتہ اصحاب بالعموم اور اُردُو شعراء بالخصوص عرصے سے مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مُرغ اور مُلّا صرف صبح اذان دیتے ہیں۔ اٹھارہ مہینے اپنے عادات و خصائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو میں جان بوجھ کر عین اس وقت سوتا ہوں جو قدرت نے مرغ کے اذان دینے کے لیے مقرر کیا ہے یا یہ ادبدا کر اس وقت اذان دیتا ہے جب خدا کے گنہگار بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوں۔ بہر صورت ہمارے محبوب ترین اوقات اتوار کی صبح اور سہ پہر ہیں۔ آج بھی چھوٹے قصبوں میں کثرت سے ایسے خوش عقیدہ حضرات مل جائیں گے جن کا ایمان ہے کہ مرغ بانگ نہ دے تو پَو نہیں پھٹتی، لہٰذا کفایت شعار لوگ الارم والی ٹائم پیس خریدنے کے بجائے مرغ پال لیتے ہیں تا کہ ہمسایوں کو سحر خیزی کی عادت رہے۔ بعضوں کے گلے میں

قدرت نے وہ سحرِ حلال عطا کیا ہے کہ نیند کے مارے تو ایک طرف رہے، ان کی بانگ سن کر ایک دفعہ تو مُردہ بھی کفن پھاڑ کر اکڑوں بیٹھ جائے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مرغ کی آواز، اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر گھوڑے کی آواز بھی اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اب یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر مرغ اذان کیوں دیتا ہے! ہم پرندوں کی نفسیات کے ماہر نہیں۔ البتہ معتبر بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ صبح دم چڑیوں کا چہچہانا اور مرغ کی اذان دراصل عبادت ہے۔ لہذا جب مرزا عبدالودود بیگ نے ہم سے پوچھا کہ مرغ اذان کیوں دیتا ہے! تو ہم نے سیدھے سبھاؤ یہی جواب دیا کہ اپنے رب کی حمد و ثناء کرتا ہے۔

کہنے لگے۔ ”صاحب اگر یہ جانور واقعی اتنا عبادت گزار ہے تو مولوی اسے اتنے شوق سے کیوں کھاتے ہیں؟“

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تھکا ماندہ بارش میں شرابور گھر پہنچا تو دیکھا کہ تین مرغے میرے پلنگ پر با جماعت اذان دے رہے ہیں۔ سفید چادر

پر جا بجا پنجوں کے تازہ نشان تھے۔ البتہ میری قبل از وقت واپسی کے سبب جہاں جگہ خالی رہ گئی تھی، وہاں سفید دھبّے نہایت بدنام معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے ذرا درشتی سے سوال کیا۔ "آخر یہ گلا پھاڑ پھاڑ کے کیوں چیخ رہے ہیں۔"

بولیں۔ "آپ تو خواہ مخواہ الرجک (Allergic) ہو گئے ہیں۔ یہ بیچارے چونچ بھی کھولیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے چڑِا رہے ہیں؟"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دل نے کہا۔ بس بہت ہو چکا، آؤ آج دوٹوک فیصلہ ہو جائے۔ "اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں۔" میں نے بپھر کر کہا۔

ان کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھر آئے۔ ہراساں ہو کر کہنے لگیں۔ "مینہ برستے میں آپ کہاں جائیں گے؟"

اس جنس کے بارے میں ایک مایوس کُن انکشاف یہ بھی ہوا کہ خواہ آپ موتی چگائیں، خواہ سونے کا نوالہ کھلائیں مگر اس کو کیڑے مکوڑے، جھینگر، بھنگے، چیونٹے اور کیچوے کھانے سے باز نہیں رکھ سکتے، اور میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا اثر و نفوذ انڈے میں نہ ہو۔ پھر موپساں کے افسانے کا ہیرو اگر یہ دعویٰ کرے کہ وہ زردی کی بو سے یہ بتا سکتا ہے کہ مرغی نے کیا کھایا تھا تو اچنبھے کی بات نہیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے ایسے لائق قیافہ شناس دال روٹی پر جی

رہے ہیں جو ذرا سی بوٹی چکھ کر نہ صرف بکری کے چارے بلکہ چال چلن کا بھی مفصّل حال بتا سکتے ہیں۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ کھَلی اور بھوسے کی خاصیت، اور چوپایوں کی خصلت کے پیشِ نظر، بعض نفاست پسند والیانِ ریاست اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ جن بھینسوں کے دودھ کی بالائی ان کے دستر خوان پر آئے، ان کو صبح و شام بادام اور پستے کھلائے جائیں تا کہ اس کا اصل ذائقہ اور مہک بدل جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عمدہ دودھ کی خوبی یہ تھی کہ اسے پی کر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ دودھ ہے۔

ایک اور سنگین غلط فہمی جس میں خواص و عوام مبتلا ہیں اور جس کا ازالہ میں رفاہِ عامّہ کے لیے نہایت ضروری خیال کرتا ہُوں، یہ ہے کہ مُرغیاں ڈربے اور ٹاپے میں رہتی ہیں، میرے ڈیڑھ سال کے مختصر مگر بھرپور تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ مرغیاں ڈربے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں اور جہاں نظر نہ آئیں، وہاں اپنے درودونزول کا ناقابلِ تردید ثبوت چھوڑ جاتی ہیں۔ ان آنکھوں نے بارہا غسل خانے سے انڈے اور کتابوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے۔ لحاف سے کڑک مُرغی اور ڈربے سے شیو کی پیالی بر آمد ہونا روزمرہ کا معمول ہو گیا۔ اور یوں بھی ہوا ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ مگر میرے ہیلو! کہنے سے پیشتر ہی مُرغ نے ٹانگوں کے درمیان

کھڑے ہو کر اذان دی، اور جن صاحب نے ازراہِ تلطّف مجھے یاد فرمایا تھا انہوں نے "سوری رانگ نمبر" کہہ کر جھٹ فون کر دیا۔

پھر ایک اتوار کو شور سے آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ بچے اصیل مُرغ کو مار مار کر بیضوی پیپر ویٹ پر بٹھا رہے ہیں۔ مانتا ہوں کہ اس دفعہ مرغ بے قصور تھا۔ لیکن دوسرے دن اتفاقاً دفتر سے ذرا جلد واپس آ گیا تو دیکھا کہ محلے بھر کے بچے جمع ہیں اور ان کے سروں پر چیل کوے منڈلا رہے ہیں۔ ذرا نزدیک گیا تو پتا چلا کہ میرے نئے کیرم بورڈ پر لنگڑے مرغ کا جنازہ بڑی دھوم سے نکل رہا تھا۔ سب بچے اپنے اپنے قد کے مطابق چار چار کی ٹولیوں میں بٹ گئے اور باری باری کندھا دے رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو جلوس کے آخر میں کچھ ایسے شرکاء بھی نظر آئے جو گھٹنوں چل رہے تھے اور اس بات پر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے کہ انہیں کندھا دینے کا موقع کیوں نہیں دیا جاتا۔

اور اس کے کچھ دن بعد چشمِ حیراں نے دیکھا کہ ہمسایوں میں شیرینی تقسیم ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ "شہ رُخ" (چتکبرا مرغ) نے آج پہلی بار اذان دی ہے۔ میں نے اس فضول خرچی پر ڈانٹا تو میرا تردّد رفع کرنے کی خاطر مجھے مطلع کیا گیا کہ خالی بوتلیں، میرے پہلے ناول کا مسودہ اور اسناد کا پلندہ (جو بقول ان کے دس

برس سے بیکار پڑا تھا) ردّی والے کو اچھے داموں بیچ کر یہ تقریب منائی جا رہی ہے۔ قصّہ مختصر چند ہی مہینوں میں اس طائرِ لاہوتی نے گھر کا وہ نقشہ کر دیا کہ اسے دیکھ کر وہی شعر پڑھنے کو جی چاہتا تھا جو قدرے مختلف حالات میں حُسنا پری نے حاتم طائی کو سنایا تھا:

یہ گھر جو کہ میرا ہے تیرا نہیں

پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اب گھر اچھا خاصا پولٹری فارم (مرغی خانہ) معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پولٹری فارم میں عام طور سے اتنے آدمیوں کے رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

جو حضرات آلامِ دنیوی سے عاجز و پریشان رہتے ہیں، ان کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مرغیاں پال لیں۔ پھر اس کے بعد پردۂ غیب سے کچھ ایسے نئے مسائل اور فتنے خود بخود کھڑے ہوں گے کہ انہیں اپنی گزشتہ زندگی جنّت کا نمونہ معلوم ہوگی!

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ادھر ایک تشویش ناک صورت یہ رونما ہوئی کہ ایک مرغ کٹ کھنّا ہو گیا۔ پہلے تو ہوا یہ کرتا تھا کہ جب بچّوں کو تماشہ دیکھنا منظور ہوتا تو دو مرغوں کے منہ پر توے کی کلونس لگا کر کھانے کی میز پر چھوڑ دیتے اور لڑائی

کے بعد میز پوش کے داغ دھبوں کو ربڑ سے مٹانے کی کوشش کرتے۔ لیکن اب کسی اہتمام کی ضرورت نہ رہی، کیوں کہ وہ دن بھر پڑوسیوں کے مرغوں سے فی سبیل اللہ لڑتا اور شام کو مجھے لڑاتا۔ یہاں یہ بتانا شاید بے محل نہ ہو گا کہ مرغ کے مشاغل و فرائض منصبی کے بارے میں میرا اب بھی یہ تصور ہے کہ:

مُرغا وہ مرغیوں میں جو کھیلے

نہ کہ مرغوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

معاملہ ہم جنس تک ہی رہتا تو غنیمت تھا لیکن اب تو یہ ظالم مرغیوں سے زیادہ آنے جانے والوں پر نظر رکھنے لگا۔ مرزا عبد الودود بیگ سے میں نے ایک دفعہ تذکرہ کیا تو کہنے لگے کیا بات ہے۔ ہم پر تو ذرا نہیں لپکتا۔ ان کے جانے کے بعد راقم الحروف قدِّ آدم آئینے کے سامنے دیر تک کھڑا رہا۔ لیکن عکس میں بظاہر کوئی ایسی بات نظر نہ آئی جسے دیکھتے ہی کسی امن پسند جانور کی آنکھوں میں خون اُتر آئے۔ بہر حال جب پڑوسیوں کی شکایتیں بڑھیں تو ایک مشہور مرغ باز سے رجوع کیا۔ اس نے کہا کہ قدرت نے اس پرند کو ہر لحاظ سے ہری چُگ بنایا ہے اور یہ مرغ غالباً اس لیے کٹ کھنّا ہو گیا کہ آپ نے اسے بچا کھُچا گوشت کھِلا دیا۔ میں نے گھر پہنچ کر تشخیص سے آگاہ کیا تو کہنے لگیں۔

"توبہ! اب ہم اتنے بُرے بھی نہیں کہ ہمارا جھوٹا کھانا کھا کے اس منحوس کا یہ حال ہو جائے۔!"

افتادِ طبع کے اعتبار سے میں گوشہ نشین واقع ہوا ہوں۔ اور اگر یہ مرغیاں نہ ہوتیں تو محلے میں مجھے کوئی نہ جانتا۔ ان دنوں "ڈربے والا مکان" اس علاقے میں ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا تھا جس کے حوالے سے ہمسائے اپنی گمنام کوٹھیوں کا پتہ بتاتے تھے۔ انہی کے توسّل سے ہمسائیوں سے تعارف اور تعلّق ہوا۔ اور انہی کی بدولت بہت سی دوررس اور دیرپا رنجشوں کی بنیاد پڑی۔ شمعون صاحب سے اس لیے عداوت ہوئی کہ میری مرغی ان کی گلاب کی پود کھا گئی اور ہارون صاحب سے اس واسطے بگاڑ ہوا کہ ان کا کُتّا اس مرغی کو کھا گیا۔ دونوں مجھی سے خفا تھے۔ حالانکہ منطق اور انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ دونوں حضرات اس قضیے کو آپس میں بالا ہی بالا طے کر لیتے۔

جس دن خلیل منزل والے ایک قوی ہیکل "لائٹ سسکس" مرغ کہیں سے لے آئے تو ہمارے ڈربوں میں گویا ہلچل سی مچ گئی۔ جب وہ گردن پھُلا کر اذان دیتا تو مرغیاں تڑپ کر ہی رہ جاتیں۔ خود خلیل صاحب اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ حالانکہ میری ناقص رائے میں کسی مرغ کو دیکھ کر اس قدر خوش ہونے

کا حق صرف مرغیوں کو پہنچتا ہے۔ میں تو اسی وجہ سے اپنے سے بہتر نسل کا جانور پالنے کے سخت خلاف ہوں۔ بہرحال یہ اپنے اپنے ظرف اور ذوق کا سوال ہے، جس سے مجھے فی الحال کوئی سروکار نہیں۔ کہہ یہ رہا تھا جس روز سے اس کا ہمارے یہاں آنا جانا ہوا مجھے اپنے تعلقات خراب ہوتے نظر آئے۔ آخر ایک دن اس نے ہماری بکاؤلی (سیاہ منار کا مُرغی) کی آنکھ پھوڑ دی۔ رات بھر اپنی تقریر کا ریہرسل کرنے کے بعد میں دوسرے دن خلیل صاحب کو ڈانٹنے گیا۔ جس وقت میں پہنچا تو وہ اپنی ہتھیلی پر ایک انڈا رکھے حاضرین کو اس طرح اِترا اِترا کر دِکھا رہے تھے جیسے وہ ان کی ذاتی محنت اور صبر کا پھل ہو۔

ملاقات کی روداد درج ذیل ہے۔:

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میں ڈربے والے مکان میں رہتا ہوں۔“

بولے۔ ”کوئی حرج نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کل آپ کے مرغے نے میری مرغی کی آنکھ پھوڑ دی۔“

فرمایا۔ ”اطلاع کا شکریہ۔ دائیں یا بائیں!“

حافظے پر بہت زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا کہ کون سی تھی۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

کہنے لگے۔ "آپ کے نزدیک دائیں بائیں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔"

"مگر یہ غلط بات ہے۔" میں نے اصل واقعہ کی طرف توجہ دلائی۔

"جی ہاں۔ صریحاً غلط بات ہے۔ اس لیے کہ آپ کی مرغی دوغلی ہے اور۔۔۔۔"

"اور آپ کا مُرغا راج ہنس ہے۔" میں نے بات کاٹی۔

تڑپ کر بولے۔ "آپ مجھے برا بھلا کہہ لیجیے۔ مرغ تک کیوں جاتے ہیں! (ذرا دم لے کر) لیکن قبلہ اگر وہ راج ہنس نہیں ہے تو آپ کی مرغی یہاں کیوں آئی۔"

"آخر جانور ہی تو ہے۔ انسان تو نہیں جو منہ باندھے پڑا رہے۔" میں نے سمجھایا۔

ارشاد ہوا۔ "آپ اپنی پدمنی کو باندھ کے نہیں رکھ سکتے تو بندہ بھی اس کی چونچ پر غلاف چڑھانے سے رہا۔"

غرض کہ ظلم و زیادتی کے خلاف جب بھی آواز اٹھائی، اسی طرح اپنی رہی سہی اوقات خراب کرائی۔

اگرچہ بارہا رانی کھیت کی وبا آئی اور آن کی آن میں ڈربے کے ڈربے صاف کر گئی، لیکن اللہ کی رحمت سے ہماری مرغیاں ہر دفعہ محفوظ رہیں۔ مگر آئے دن کی رقابتیں اور رنجشیں رانی کھیت سے زیادہ جان لیوا ثابت ہوئیں اور قضیہ رفتہ رفتہ یوں طے ہوا کہ کچھ مرغیاں تو پڑوسیوں کے کُتّے کھا گئے اور جو ان سے بچ رہیں، ان کو پڑوسی خود کھا گئے۔

اللہ بس باقی ہوس!

کرکٹ

مرزا عبدالودود بیگ کا یہ دعویٰ کچھ اس ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا کہ کرکٹ بڑی تیزی سے ہمارا قومی کھیل بنتا جارہا ہے۔ قومی کھیل سے غالباً اُن کی مراد ایسا کھیل ہے جسے دُوسری قومیں نہیں کھیلیں۔

ہم آج تک کرکٹ نہیں کھیلے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں اس کی برائی کرنے کا حق نہیں۔ اب اگر کسی شخص کو کُتّے نے نہیں کاٹا، تو کیا اس بدنصیب کو کتّوں کی مذمّت کرنے کا حق نہیں پہنچتا؟ ذرا غور کیجیئے۔ افیم کی برائی صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں، جو افیم نہیں کھاتے۔ افیم کھانے کے بعد ہم نے کسی کو افیم کی برائی کرتے نہیں دیکھا۔۔۔ برائی کرنا تو بڑی بات ہے، ہم نے کچھ بھی تو کرتے نہیں دیکھا۔

اب بھی بات صاف نہیں ہوئی تو ہم ایک اور مُستند نظیر پیش کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو گُڑ سے سخت چِڑ تھی۔ ان کا قول ہے کہ جس نے ایک مرتبہ گُڑ

چکھ لیا اس کو تمام عمر دُوسری مِٹھاس پسند نہیں آسکتی۔ چونکہ وہ خود شکر کی لطیف حلاوتوں کے عادی مدّاح تھے، لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ بھی ساری عمر گُڑ کھائے بغیر گُڑ کی برائی کرتے رہے۔

یوں تو آج کل ہر وہ بات جس میں ہارنے کا امکان زیادہ ہو کھیل سمجھی جاتی ہے۔ تاہم کھیل اور کام میں جو بین فرق ہماری سمجھ میں آیا، یہ ہے کہ کھیل کا مقصد خالصتاً تفریح ہے۔ دیکھا جائے تو کھیل کام کی ضِد ہے۔ جہاں اس میں گھمبیرتا آئی اور یہ کام بنا۔ یہی وجہ ہے کہ پولو انسان کے لیے کھیل ہے اور گھوڑے کے لیے کام! ضِد کی اور بات ہے ورنہ خود مرزا بھی اس بنیادی فرق سے بے خبر نہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن وہ ٹنڈو اللہ یار سے معاوضہ پر مشاعرہ "پڑھ" کے لوٹے تو ہم سے کہنے لگے:

"فی زمانہ، ہم تو شاعری کو، جب تک وہ کسی کا ذریعہ معاش نہ ہو، نِری عیاشی بلکہ بدمعاشی سمجھتے ہیں۔"

اب یہ تنقیح قائم کی جاسکتی ہے کہ آیا کرکٹ کھیل کے اس معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ فیصلہ کرنے سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کرکٹ دراصل انگریزوں کا کھیل ہے اور کچھ انھی کے بلغمی مزاج سے لگّا کھاتا ہے۔ ان کی قومی خصلت ہے

کہ وہ تفریح کے معاملے میں انتہائی جذباتی ہو جاتے ہیں اور معاملاتِ محبّت میں پہلے درجے کے کاروباری! اِسی خوشگوار تضاد کا نتیجہ ہے کہ ان کا فلسفہ حد درجہ سطحی ہے اور مزاح نہایت گہرا۔

کرکٹ سے ہماری دل بستگی ایک پرانا واقعہ ہے جس پر آج سو سال بعد تعجّب یا تاسف کا اظہار کرنا اپنی ناواقفیتِ عامہ کا ثبوت دینا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی رستخیز کے بعد بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی ہمارے پرکھوں کو انگریزی کلچر اور کرکٹ کے باہمی تعلق کا احساس ہو چلا تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خان نے بھی انگریزی تعلیم و تمدّن کے ساتھ ساتھ کرکٹ کو اپنانے کی کوشش کی۔ روایت ہے کہ جب علی گڑھ کالج کے لڑکے میچ کھیلتے ہوتے تو سر سید میدان کے کنارے جانماز بچھا کر بیٹھ جاتے۔ لڑکوں کو کھیلتا دیکھتے اور رو رو کر دُعا مانگتے:

”الٰہی! میرے بچّوں کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔“

جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، کرکٹ انگریزوں کے لئے مشغلہ نہیں، مشن ہے لیکن اگر آپ نے کبھی کرکٹ کی ٹیموں کو مئی جون کی بھری دوپہر میں ناعاقبت اندیشانہ جرأت کے ساتھ موسم کو چیلنج کرتے دیکھا ہے تو ہماری طرح آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ہمارے ہاں کرکٹ مشغلہ ہے نہ مشن

اچھی خاصی تعزیری مشقّت ہے، جس میں کام سے زیادہ عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔ اب اگر کوئی سَر پھرا مُنہ مانگی اُجرت دے کر بھی اپنے مزدوروں سے ایسے موسمی حالات میں یوں کام کرائے تو پہلے ہی دن اس کا چالان ہو جائے۔ مگر کرکٹ میں چونکہ عام طور سے معاوضہ لینے کا دستور نہیں، اس لیے چالان کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاتھوں جس طرح ہلکا پھلکا کھیل ترقی کر کے کام میں تبدیل ہو گیا وہ اس کے موجدین کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔ غالب نے شاید اسی ہی کسی صُورتِ حال سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ہم مغل بچّے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔

اور اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کھیل کے معاملے میں ہمارا رویہ بالغوں جیسا نہیں، بالکل بچّوں کا سا ہے۔۔۔ اس لحاظ سے کہ صرف بچّے ہی کھیل میں اتنی سنجیدگی برتتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے بچّہ سیانا ہوتا ہے۔ کھیل کے ضمن میں اس کا رویہ غیر سنجیدہ ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی ذہنی بلوغ کی علامت ہے۔

کرکٹ کے رسیا ہم جیسے ناآشنائے فن کو لاجواب کرنے کے لیے اکثر کہتے ہیں۔ ”میاں! تم کرکٹ کی باریکیوں کو کیا جانو؟ کرکٹ اب کھیل نہیں رہا۔ سائنس بن گیا ہے سائنس!“

عجیب اتفاق ہے۔ تاش کے دھتا بھی رمی کے متعلق نہایت فخر سے یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سولہ آنے سائنٹیفک کھیل ہے۔ بکنے والے بکا کریں، لیکن ہمیں رمی کے سائنٹیفک ہونے میں مطلق شبہ نہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ روپیہ ہارنے کا اس سے زیادہ سائنٹیفک طریقہ ہنوز دریافت نہیں ہوا۔ پس ثابت ہوا کہ کرکٹ اور رمی قطعی سائنٹیفک ہیں اور اسی بنا پر کھیل نہیں کہلائے جاسکتے۔ بات یہ ہے کہ جہاں کھیل میں دماغ پر زور پڑا کھیل کھیل نہیں رہتا کام بن جاتا ہے۔ ایک دفعہ کرکٹ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ہم نے مرزا سے کہا کہ کھیلوں میں وہی کھیل افضل ہے جس میں دماغ پر کم سے کم زور پڑے۔

فرمایا "بجا! آپ کی طبعِ نازک کے لیے جُوا نہایت موزوں رہے گا۔ کس واسطے کہ جوئے کی قانونی تعریف یہی ہے کہ اسے کھیلنے کے لیے عقل قطعی استعمال نہ کرنی پڑے۔"

محض کرکٹ ہی پر منحصر نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ رجحان عام ہے کہ تعلیم نہایت آسان اور تفریح روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے (مثلاً بی اے کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر برج سیکھنے کے لئے عقل درکار ہے) ریڈیو، ٹیلیویژن سینما اور

باتصویر کتابوں نے اب تعلیم کو بالکل آسان اور عام کر دیا ہے، لیکن کھیل دن بدن گراں اور پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں لہٰذا بعض غبی لڑکے کھیل سے جی چرا کر تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔ اس سے جو سبق آموز نتائج رونما ہُوئے وہ سیاست دانوں کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہیں۔

کسی اعتدال پسند دانا کا قول ہے کہ "کھیل کے وقت کھیل اور کام کے وقت کام اچھا۔" اگر ہم یہ کہیں کہ ہمیں اس زرّیں اُصول سے سراسر اختلاف ہے تو اس کو یہ معنی نہ پہنائے جائیں کہ خدانخواستہ ہم شام و سحر، آٹھوں پہر کام کرنے کے حق میں ہیں۔ سچ پوچھیئے تو ہم اپنا شمار اُن نارمل افراد میں کرتے ہیں جن کو کھیل کے وقت کھیل اور کام کے وقت بھی کھیل ہی اچھا لگتا ہے۔ اور جب کھُل کر باتیں ہو رہی ہیں تو یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ فی الواقع کام ہی کے وقت کھیل کا صحیح لُطف آتا ہے۔ لہٰذا کرکٹ کی مخالفت سے یہ استنباط نہ کیجئے کہ ہم تفریح کے خلاف بپھرے ہوئے بوڑھوں (Angry Old Men) کا کوئی متحدّہ محاذ بنانے چلے ہیں۔ ہم بذاتِ خُود سو فیصد تفریح کے حق میں ہیں خواہ وہ تفریح برائے تعلیم ہو خواہ تعلیم براہ تفریح! ہم تو محض یہ امر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ قدیم طریق تعلیم سے جدید تفریح ہزار درجے بہتر ہے۔

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

تمہید قدرے طویل اور سُخن گُسترانہ سہی، لیکن بوجوہ ناگزیر تھی۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور آنکھوں دیکھا حال سُناتے ہیں۔ ٹیسٹ میچ کے ہنگامہ پرور زمانے کا ذِکر ہے۔ شہر کی آبادی دو حصّوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک حصّہ کہ

جس میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں ہوشیار بھی ہیں

اپنے اپنے گھروں میں بیٹھا ریڈیو کمنٹری سُن رہا تھا۔ دوسرا انبوہ ان سفید پوشوں پر مشتمل تھا، جو عزّت کی خاطر اپنی اپنی چھتّوں پر خالی ایریل لگا کر خود ایرانی ہوٹلوں اور پان کی دُکانوں کے سامنے کھڑے کمنٹری سُن رہے تھے۔ پاکستان ایک میچ جیت چکا تھا اور کرکٹ کے خلاف ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالنا غدّاری کے مترادف تھا۔ مرزا کرکٹ کو اپنے آپ پر طاری کر کے کہنے لگے "یہ کھیلوں کا بادشاہ ہے۔"

ہماری جو شامت آئی تو بول اٹھے "مرزا کرکٹ رئیسوں کا کھیل ہے۔ دیکھتے نہیں یہ مر رہا ہے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ کیونکہ نہ اسے روسی کھیلتے ہیں نہ امریکی۔"

"اسی سے کچھ اُمید بندھتی ہے کہ شاید یہ کھیل زندہ رہ جائے۔" مرزا نے چھُوٹتے ہی دھلا لگایا۔

"ایسا مہنگا اور پیچیدہ کھیل جس کا میچ مسلسل پانچ دن تک گھسٹتا رہے اور جِسے ہمارے غریب عوام نہ کھیل سکیں اور نہ دیکھ پائیں، ہر گز لائقِ التفات نہیں۔" ہم نے دکھتی ہوئی رگ پکڑی۔

"پھر کون سا کھیل لائقِ التفات ہے، حضور؟" مرزا نے چڑاؤ نے انداز میں پوچھا۔

"اس سے بہتر تو بیس بال رہے گی۔" ہم نے کہا۔

"بات ایک ہی ہے۔ آدھا بیٹ ٹوٹ جانے کے بعد بھی کرکٹ جاری رہے تو امریکہ میں اسے بیس بال کہتے ہیں۔ کسی اور کھیل کا نام لو۔" مرزا نے کہا۔

"ٹینس۔" ہمارے مُنہ سے بے ساختہ نِکلا۔

"اگر تم نے کبھی ٹینس میچ میں گیند کے ساتھ سینکڑوں تماشائیوں کی گردنیں ایک ساتھ پنڈولم کی طرح دائیں بائیں گھومتی دیکھی ہیں تو بخدا تمہیں اس کھیل ہی سے نفرت ہو جائے گی۔" مرزا نے کہا۔

"اس کے یہ معنی ہوئے کہ تمہیں ٹینس دیکھنے پر اعتراض ہے۔ مت دیکھو۔ مگر کھیلنے میں کیا حرج ہے؟" ہم نے دبایا۔

"جی نہیں! یورپ میں ٹینس بیکار مردوں اور تندرست عورتوں کا کھیل ہے۔ صاحب! اچھے کھیل کی خوبی یہ ہے کہ

کچھ ہاتھ ہلیں، کچھ پاؤں ہلیں اچھلیں بازُو، پھڑکے سب تن۔"

مرزا نے ایکا ایکی ہمارے مقابلے پر نظیر اکبر آبادی کو لا کھڑا کیا، جن سے نبٹنا فی الجملہ ہمارے لئے مشکل تھا۔

"چلو ہاکی سہی۔" ہم نے سمجھوتے کے انداز میں کہا۔

"چھی! ہماری یہ بڑی کمزوری ہے کہ اپنی ٹیم کسی کھیل میں جیت جائے تو اسے قومی کھیل سمجھنے لگتے ہیں اور اس وقت تک سمجھتے رہتے ہیں جب تک کہ ٹیم دوسرا میچ ہار نہ جائے۔" مرزا فتویٰ دیا۔

"تمہیں پسند نہ آئے یہ اور بات ہے۔ مگر کراچی میں ہاکی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اگر کہیں دوستانہ میچ بھی ہو رہا ہو تو خلقت اس بُری طرح ٹوٹتی ہے کہ فیلڈ تک میں کھیلنے کی جگہ نہیں رہتی۔" ہم نے کہا۔

"خدا آباد رکھے کراچی کا کیا کہنا! بندر روڈ پر کوئی شخص راہ چلتے یونہی پان کی پیک تھوک دے اور پھر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے تو دو منٹ میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور سارا ٹریفک رُک جائے۔ یاد رکھو تماشے میں جان تماشائی کی تالی سے پڑتی ہے نہ کہ مداری کی ڈگڈگی سے۔" مرزا نے بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

مرزا کہنے لگے "کرکٹ اشراف کھیلتے ہیں۔ فٹ بال دیہاتیوں کا کھیل ہے۔ جٹ گنواروں کا! ہڈیاں تڑوانے کے اور بھی مہذّب طریقے ہو سکتے ہیں۔ لا حول ولا قوۃ! اس باجماعت بدتمیزی کو کھیل کس نے کہہ دیا؟ آپ نے شاید وہ لطیفہ نہیں سُنا کہ ایک پرانا کھلاڑی چند سِکھّوں کو فٹ بال کھیلنا سِکھا رہا تھا۔ جب کھیل کے سب قاعدے ایک ایک کر کے سمجھا چکا تو آخر میں یہ گُر کی بات بتائی کہ ہمیشہ یاد رکھو سارے کھیل کا دارومدار فقط زور سے کِک لگانے پر ہے۔ اس سے کبھی نہ چوکو اگر گیند کو کِک نہ کر سکو تو پرواہ نہیں۔ اپنے مخالف ہی کو کِک کر دو۔ اچھا اب کھیل شروع کرو۔ گیند کدھر ہے؟ یہ سُن کر ایک سردار جی اپنا جانگھیا چڑھاتے ہوئے بیتابی سے بولے۔ گیند دی ایسی تیسی! تُسی کھیل شروع کرو، خالصہ!"

"لیکن گنواروں اور دیہاتیوں کے ساتھ کھیلنے میں کون سی ہیٹی ہوتی ہے؟" ہم نے اپنے جمہوری جذبے سے تقریباً نڈھال ہو کر پوچھا۔

"تفریح میں بُری صحبت سے پرہیز لازم ہے۔ یاد رکھئے آپ تجارت اور عبادت تو کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن تاش صرف اشرافوں کے ساتھ کھیلنے چاہئیں۔ یہیں نہیں یورپ بھی اس فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ وہاں بڑے سے بڑے اسٹاک ایکسچینج اور گرجا میں ہر کس و ناکس کو بے روک ٹوک جانے کی اجازت ہے۔ مگر کلب اور کسینو (قمار خانہ) میں فقط خاندانی شرفا بار پاتے ہیں۔"

کیا عرض کریں، کرکٹ کے مخالفوں کو قائل معقول کرنے کے لیے مرزا کیسی کیسی دھاندلی روا سمجھتے ہیں اور آن واحد میں بات کو تنگنائے منطق سے نکال کر اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں بات کرتے دشمنوں کی زبان کٹتی ہے۔ بات گنجلک ہوئی جاتی ہے۔ اس لیے ہم وضاحتاً ان کے بُرہان قاطع کی ایک ادنیٰ مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک دن کرکٹ کے جسمانی فوائد (روحانی فیوض کا بیان آگے آئے گا) پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمانے لگے:

"کرکٹ سے کلائی مضبوط ہوتی ہے۔"

"کلائی مضبوط ہونے سے فائدہ؟"

"کرکٹ اچھا کھیلا جاتا ہے۔"

ایک اور نازک موقع پر انہوں نے اسی قِسم کی منطق سے ایک کج فہم کا ناطقہ بند کیا۔ ان صاحب کا استدلال تھا کہ کرکٹ میں ہر وقت چوٹ چپیٹ کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ مرزا کو قائل کرنے کی غرض سے انہی کے سر کی قسم کھا کے کہنے لگے۔ "میرے سامنے کے تین دانت کرکٹ ہی کی نذر ہوئے۔ (اندرونی چوٹوں کا کوئی شمار نہیں) وہ تو کہئے بڑی خیر ہوئی کہ میرے اوسان خطا نہیں ہوئے۔ اگر میں عین وقت پر منہ نہ پھاڑ دیتا تو کہیں زیادہ نقصان ہوتا۔" بعد کو اُنہوں نے کرکٹ کی راہ میں دیگر اعضاء بدن کے باری باری مجروح و ماؤف ہونے کی درد بھری داستان پیچ دار سُنائی۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ ان کے اپنے تاریخی زخموں کی مجموعی تعداد رانا سانگا کے ستّر زخموں سے کسی طرح کم نہیں۔

مرزا نے جھنجلا کر کہا۔ "مگر دستانے پیڈ اور گارڈ آخر کِس مرض کی دوا ہیں؟"

وہ صاحب بولے "دیکھئے نا! یہ زرہ بکتر تو خُود اس بات کی دلیل ہے کہ کھیل واقعی خطرناک ہے۔ ان حفاظتی تدابیر کا سُن کر مجھے اس وقت اپنے گاؤں کا وہ زمیندار یاد آ رہا ہے جس نے ستّر سال کی عمر میں ایک سولہ سالہ لڑکی سے شادی کی تھی۔ ابھی سہاگ کے جوڑے کا کلف بھی ٹھیک سے نہ ٹوٹا ہو گا کہ وہ حالات پیدا ہو

گئے جن میں بعض جلد باز اصحاب قتل کر بیٹھتے ہیں لیکن آدمی تھا بلا کا دور اندیش۔ بہت کچھ غور و خوض اور اپنی طبیعت کے فطری رجحان کو دیکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا کہ خودکُشی نسبتاً آسان رہے گی۔ قتل میں بڑا کھڑاگ ہے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں ریل اور بندوق کا غلط استعمال عام نہیں ہوا تھا۔ اِس لیے غیور حضرات کو کنویں جھانکنا پڑتے تھے۔ لیکن ان دنوں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور کنویں کا پانی ایسا ٹھنڈا برف ہو رہا تھا کہ غصّے میں کوئی آدمی کود پڑے تو چھن سے آواز پیدا ہو۔ لہٰذا زمیندار نے ایک روئی کا فرغل اور دو موٹے موٹے لحاف اوڑھ کر کنویں میں چھلانگ لگائی اور آخر انہی لحافوں نے اسے نہ صرف سردی بلکہ حرام موت سے بھی بچا لیا۔"

مرزا چٹخارا لے کر بولے "بہت خوب آئندہ آپ اس لذیذ حکایت کو کرکٹ کے بجائے نکاحِ ثانی کے خلاف بطور دلیل استعمال کیجئے گا۔"

ہم نے بیچ پڑ کر مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ "ظاہر ہے لحاف اوڑھ کر کرکٹ نہیں کھیلا جا سکتا۔ مگر ایک بات آج تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی، کھلاڑی دبیز دستانے پہنتے ہیں، بھاری بھرکم پیڈ چڑھاتے ہیں، گارڈ باندھتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا الا بلا اپنے اوپر منڈھ لیتے ہیں، جب کہیں اپنے کو گیند سے محفوظ

سمجھتے ہیں۔ لیکن آخر اس کے بجائے نرم گیند کیوں نہیں استعمال کرتے؟ سیدھی سی بات ہے۔"

مرزا صریحاً کنّی کاٹ کر فلسفہ بگھارنے لگے "حضرت! مجھے سزا کے طور پر بھی وہ کھیل منظور نہیں جس میں چوٹ کا قوی احتمال نہ ہو۔ مردوں کو چوٹ کھا کے مسکرانے کی عادت ہونی چاہیے۔"

"چوٹ کھانے سے حاصل؟"

"آدمی مضبوط ہوتا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"آئندہ چوٹ لگے تو چیخ نہیں نکلتی۔"

مرزا کو کرکٹ سے کتنی دلچسپی اور اس کی باریکیوں سے کس حد تک واقفیت ہے، ہمیں اس کا تھوڑا بہت اندازہ پانچ سال قبل ہوا۔ ٹیسٹ کا چوتھا دن تھا اور ایک سلو باؤلر بولنگ کر رہا تھا۔ اس کی کلائی کے ایک ادنیٰ اشارے، انگلیوں کی ایک خفیف سی حرکت پر گیند ناچ اُٹھتی اور تماشائی ہر گیند پر کرسیوں سے اُٹھ اُٹھ کر داد دیتے اور داد دے کر باری باری ایک دوسرے کی گود میں بیٹھ جاتے۔

ہمارے پاس ہی ایک میم کے پیچھے، کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا بوڑھا پارسی تک اپنے پوپلے مُنہ سے سیٹی بجا بجا کر باؤلر کا دل بڑھا رہا تھا۔ ادھر اسٹیڈیم کے باہر درختوں کی پھننگوں سے لٹکے ہوئے شائقین ہاتھ چھوڑ چھوڑ کر تالیاں بجاتے اور کپڑے جھاڑ کر پھر درختوں پر چڑھ جاتے تھے۔ ہر شخص کی نظریں گیند پر گڑی ہوئی تھیں۔ ایک بارگی بڑے زور سے تالیاں بجنے لگیں۔

"ہے! بڑے غضب کی گُگلی ہے!" ہم نے جوش سے مرزا کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"نہیں یار! مدراسن ہے۔" مرزا نے دانت بھینچ کر جواب دیا۔

ہم نے پلٹ کر دیکھا تو مرزا ہی کی رائے صحیح نکلی۔ بلکہ بہت خُوب نِکلی۔

ان کی دلچسپی کا اندازہ اس اہتمام سے بھی ہوتا ہے جو پچھلے تین برس سے ان کے معمولات میں داخل ہو چکا ہے۔ اب وہ بڑے چاؤ سے لدے پھندے ٹیسٹ میچ دیکھنے جاتے ہیں۔ ڈیڑھ دو سیر بھُوبل کی بھُنی مونگ پھلی، بیٹری کا ریڈیو[۲] اور تھرماس! یہاں ہم نے ناشتے دان، سگریٹ دھوپ کی عینک اور اسپرو کی ٹکیوں کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ یہ تو ان لوازمات میں سے ہیں جن کے بغیر کوئی دور اندیش آدمی یہ کھیل دیکھنے کا قصد نہیں کرتا۔ یوں تو تازہ اخبار بھی ساتھ ہوتا

[۲] اس زمانے میں ٹرانزسٹر عام نہیں ہوئے تھے۔

ہے مگر وہ اس سے چھتری کا کام لیتے ہیں۔ خود نہیں پڑھتے البتہ پیچھے بیٹھنے والے بار بار صفحہ اُلٹنے کی درخواست کرتے رہتے ہیں۔ دن بھر ریڈیو سے چمٹے کمنٹری سنتے رہتے ہیں بلکہ ہمارا خیال ہے کہ انہیں کمنٹری سُننے سے زیادہ سُنانے میں لطف آتا ہے۔ البتہ کمنٹری آنا بند ہو جائے تو کھیل بھی دیکھ لیتے ہیں۔ یا پھر اس وقت سر اٹھا کر فیلڈ کی طرف دیکھتے ہیں جب ریڈیو پر تالیوں کی آواز سے کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ میچ کسی اور شہر میں ہو رہا ہو تو گھر بیٹھے کمنٹری کے جوشیلے حصّوں کو ٹیپ پر ریکارڈ کر لیتے ہیں اور آئندہ ٹیسٹ تک اسے سُنا سُنا کر دوسرے مسلمان بھائیوں کا خون کھولاتے رہتے ہیں۔

جاہلوں کا ذکر نہیں بڑے بڑوں کو ہم نے اس خوش فہمی میں مبتلا دیکھا کہ زیادہ نہ کم پورے بائیس کھلاڑی کھیلتے ہیں۔ ہم قواعد و ضوابط سے واقف نہیں، لیکن جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کی قسم کھا کر عرض کرتے ہیں کہ درحقیقت کرکٹ صرف ایک ہی شخص کھیلتا ہے۔ مگر اس کھیل میں یہ وصف ہے کہ بقیہ اکیس حضرات سارے سارے دِن اس مغالطے میں مگن رہتے ہیں کہ وہ بھی کھیل رہے ہیں۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حضرات شام تک سارس کی طرح کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں اور گھر پہنچ کر اس تکان کو تندرستی سمجھ کر پڑ رہے ہیں۔

مرزا کہتے ہیں (ناممکن ہے کرکٹ کا ذکر ہو اور بار بار مرزا کی دُہائی نہ دینی پڑے) کہ کھیل، علی الخصوص، کرکٹ سے طبیعت میں ہار جیت سے بے نیازی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ جیتنے کے لیے واقعی کاوش و مزاولت درکار ہے۔ لیکن ہارنے کے لیے مشق و مہارت کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ مشکل مخالف ٹیم بالعموم خود آسان کر دیتی ہے۔

اچھے اسکولوں میں شروع ہی سے تربیت دی جاتی ہے کہ جس طرح مرغابی پر پانی کی بُوند نہیں ٹھہرتی، اسی طرح اچھے کھلاڑی پر ناکامی کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض کمزور طبیعتیں اس نصیحت کا اس قدر اثر لیتی ہیں کہ ہر قسم کے نتائج سے بے پروا ہو جاتی ہیں۔

لیکن اگر ہم کھلے خزانے یہ اعتراف کر لیں کہ ہمیں جیت سے رنج اور ہار سے خوشی نہیں ہوتی تو کون سی عیب کی بات ہے؟ انگلستان کا بادشاہ ولیم فاتح اس سلسلہ میں کمال بے ساختگی و صاف دلی کی ایک مُردہ مثال قائم کر گیا ہے جو آج بھی بعضوں کے نزدیک لائقِ توجہ و تقلید ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ جب وہ شطرنج کی بازی ہار گیا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ چوبی بساط جیتنے والے کے سر پر دے ماری

جس سے اس گستاخ کی موت واقع ہو گئی۔ مورخین اس باب میں خاموش ہیں مگر قیاس کہتا ہے کہ درباریوں نے یوں بات بنائی ہو گی:

"سرکار! یہ تو بہت ہی کم ظرف نِکلا۔ جیت کی ذرا تاب نہ لا سکا۔ شادیٔ مرگ ہو گیا۔"

یہی قصّہ ایک دن نمک مرچ لگا کر ہم نے مرزا کو سُنایا۔ بگڑ گئے، کہنے لگے:

"آپ بڑا فلسفہ چھانٹتے ہیں مگر یہ ایک فلسفی ہی کا قول ہے کہ کوئی قوم سیاسی عظمت کی حامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس نے کسی نہ کسی عہد میں اپنے کھیل کالوہانہ منوایا ہو۔"

ہم نے چھیڑا "مگر قومیں پِٹ پِٹ کر ہی ہیکڑ ہوتی ہیں۔"

قوموں کو جہاں کا تہاں چھوڑ کر ذاتیات پر اُتر آئے۔ "جس شخص نے عمر بھر اپنے دامنِ صحت کو ہر قسم کی کسرت اور کھیل سے بچائے رکھا، وہ غریب کھیل کی اسپرٹ کو کیا جانے:

بچپن میں بھی تم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

میں جانتا ہوں، تم جیسے تھڑ دِلے محض ہار کے ڈر سے نہیں کھیلتے۔ ایسا ہی ہے تو پرسوں صبح بغدادی جِم خانہ آجاؤ۔ پھر تمہیں دکھائیں کہ کرکٹ کیا ہوتا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ مذکور الصّدر مقام پر ہر ہفتے دوستانہ میچ ہوتے رہتے ہیں۔ (دوستانہ میچ سے مراد ایسا میچ ہے جس میں لوگ ہار کر بھی قائل نہیں ہوتے) ابھی گزشتہ سنیچر کو عینک لگانے والوں کی ٹیم نے سِگار پینے والوں کو پورے نو وکٹوں سے شکست دی تھی اور پرسوں ان کی کمپنی کے کنوارے ملازمین اپنے افسروں اور ان کی بیویوں سے شوقیہ میچ کھیل رہے تھے۔ ہم نے کچھ ہچر مچر کی تو آنکھ مار کر کہنے لگے:

"بے پردگی کا خاص انتظام ہو گا۔ ضرور آنا۔"

ہم ناشتہ کرتے ہی بغدادی جِم خانہ پہنچ گئے۔ پروگرام کے مطابق کھیل ٹھیک دس بجے شروع ہونا چاہیے تھا مگر امپائر کا سفید کوٹ استری ہو کر دیر سے آیا۔ اس لیے چھپے ہُوئے پروگرام کے بجائے ساڑھے گیارہ بجے تک کھلاڑی مونگ پھلی کھاتے رہے۔

پندرہ منٹ کی ردّو کد کے بعد یہ طے پایا کہ جو ٹیم "ٹاس" ہارے وہی بیٹنگ کرے پھر کلدار روپیہ کھنکا۔ تالیاں بجیں۔ معطّر رومال ہَوا میں لہرائے اور مرزا کے بندھے بیٹنگ کرنے نکلے۔

ہم نے دُعا دی "خدا کرے تم واپس نہ آؤ۔"

مرزا نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور چلتے چلتے پر تاکید کی "کرکٹ مت دیکھو۔ کرکٹ کی اسپرٹ دیکھو۔"

ہم یہ بتانا بھُول ہی گئے کہ روانہ ہونے سے قبل مرزا نے اپنے بیٹ پر جُملہ تماشائیوں کے دستخط لیے۔ ایک خاتون نے (جو کسی طرف سے اَن پڑھ معلوم نہیں ہوتی تھیں) دستخط کی جگہ بیٹ پر اپنے ترشائے سُرخ سُرخ ہونٹ ثبت کر دیئے اور مرزا پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہوئے وکٹ تک پہنچے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارا راستہ اُلٹے قدموں طے کیا اور اگر بیچ میں وکٹ سے ٹکّر نہ ہوتی تو شاید ساری فیلڈ اسی طرح پار کر جاتے۔

مرزا نے کرکٹ میں بھی وہی تہیا اور تیور دکھائے جو ہم ان کے مچیٹوں اور معاشقوں میں دیکھتے چلے آئے تھے۔ یعنی تکنیک کم اور جوش زیادہ! روانگی سے

چند منٹ پہلے پیڈ کے تسمے باندھے ہُوئے انہوں نے ایک مرکھنے سے کلرک کو یہ ہتھکنڈا بتایا کہ چھکّا لگانے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ خُوب کس کے ہِٹ لگاؤ۔

کلرک نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھُورتے ہُوئے کہا۔ "یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ زور کا ہٹ کِس طرح لگایا جائے۔"

مرزا اپنی بڑی بڑی آنکھیں لال کرکے بولے "میں تو یہ کرتا ہوں کہ ہِٹ لگاتے وقت آنکھ میچ کر اپنے افسر کا تصوّر کرتا ہوں۔ خُدا کی قسم! ایسے زور کا ہِٹ لگتا ہے کہ گیند تارا ہو جاتی ہے۔"

مرزا کے کھیلنے بلکہ نہ کھیلنے کا انداز دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ افسر کا ایک فوٹو نہیں، بلکہ پورا کا پورا البم اُن کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ بیٹ کو پوری طاقت کے ساتھ گوپھن کی طرح گھمائے جا رہے تھے۔ تین اوور اسی طرح خالی گئے اور گیند کو ایک دفعہ بھی بیٹ سے ہمکنار ہونے کا موقع نہیں مِلا۔ مرزا کے مُسکرانے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وُہ اس صُورتِ حال کو باؤلر کی نالائقی سے زیادہ اپنے اُستادانہ ہتھکنڈوں پر محمول کر رہے ہیں۔ مگر اتفاق سے چوتھے اوور میں ایک گیند سیدھوں سِیدھ بیٹ پر جا لگی۔ مرزا پوری طاقت سے بیٹ دُور پھینک کر چیخے:

"ہاؤز دیٹ؟"

امپائر دوڑا دوڑا آیا۔ بیٹ اٹھا کر انہیں پکڑایا اور بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر دوبارہ کھیلنے پر رضامند کیا۔

مصیبت اصل میں یہ تھی کہ مخالف ٹیم کا لمبا تڑنگا باؤلر خدا جھوٹ نہ بلوائے پورے ایک فرلانگ سے ٹہلتا ہوا آتا۔ ایک بار گی جھٹکے کے ساتھ رُک کر کھنکارتا۔ پھر خلافِ توقع نہایت تیزی سے گیند پھینکتا۔ اس کے علاوہ حالانکہ صرف دائیں آنکھ سے دیکھ سکتا تھا مگر گیند بائیں ہاتھ سے پھینکتا تھا۔ مرزا کا خیال تھا کہ اس بے ایمان نے یہ چکرا دینے والی صورت انتظاماً بنا رکھی ہے۔ لیکن ایک مرزا ہی پر موقوف نہیں، کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ گیند کیسے اور کہاں پھینکے گا۔ بلکہ اس کی صُورت دیکھ کر کبھی کبھی تو یہ شُبہ ہوتا تھا کہ اللہ جانے پھینکے گا بھی یا نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نے گیند سے اتنے وکٹ نہیں لیے جتنے گیند پھینکنے کے انداز سے۔ بقول مرزا "مشّاق بولر سے کوئی خائف نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وکٹ ہی تو لے سکتا ہے۔ جان تو اناڑی سے نِکلتی ہے۔" سبھی کے چھکے چھُوٹ

گئے۔ گیند پھینکنے سے پہلے جب وہ اپنی ڈھائی گھر کی چال سے لہریا بناتا ہوا آتا تو اچھّے اچھّوں کے بیٹ ہاتھ کے ہاتھ میں رہ جاتے۔

آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا

سکتے میں کوئی مُنہ پہ نظر کرکے وہ گیا

ہر مرتبہ ظالم کچھ ایسے غیر پیشہ ورانہ جذبے اور جوش کے ساتھ کچکچا کے گیند پھینکتا گویا یہ وہ پہلا پتھّر ہے جس سے ایک گنہگار دوسرے گنہگار کو سنگسار کرنے جارہا ہے۔ اس کے باوجود مرزا انتہائی دندان شکن حالات میں ڈنڈے گاڑے کھڑے تھے۔

لیکن یہ درست ہے کہ رَن نہ بننے کی بڑی وجہ مرزا کے اپنے پینترے تھے۔ وہ اپنا وکٹ ہتھیلی پر لیے پھر رہے تھے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ اگر گیند اپنی طرف آتی ہوتی تو صاف ٹل جاتے۔ لیکن اگر ٹیڑھی آتی دکھائی دیتی تو اس کے پیچھے بیٹ لے کر نہایت جوش و خروش سے دوڑتے (کپتان نے بہترا اشاروں سے منع کیا مگر وہ دو دفعہ گیند کو باؤنڈری لائن تک چھوڑنے گئے) البتہ ایک دفعہ جب وہ اپنے بیٹ پر لپ اسٹک سے بنے ہوئے ہونٹوں کو محویت سے دیکھ رہے تھے تو گیند اچانک بیٹ سے آلگی اور وہ چمک کر ہوا میں گیند سے زیادہ اُچھلے۔ وکٹ کیپر

اگر بڑھ کے بیچ میں نہ پکڑ لیتا تو ایسے اوندھے مُنہ گرتے کہ ہفتوں اپنی شکل آپ نہ پہچان پاتے۔

یوں بھی بعض کھلاڑی گیند کو دیکھتے نہیں سُنتے ہیں۔۔۔ لیکن ان کو اپنے قرب و جوار میں گیند کی موجودگی کا احساس پہلے پہل اس آواز سے ہوتا ہے جو گیند اور وکٹ کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔

چند اوور کے بعد کھیل کا رنگ بدلتا نظر آیا اور یوں محسوس ہونے لگا گویا وکٹ گیند کو اپنی جانب اس طرح کھینچ رہا ہے جیسے مقناطیس لوہے کو۔ ہم نے دیکھا کہ ساتویں اوور کی تیسری گیند پر مرزا نے اپنی مسلّح و مسلّم ران درمیان میں حائل کر دی۔ سب یک زبان ہو کر چیخ اُٹھے:

"ہاؤز دیٹ؟"

"مرزا نے دانستہ اپنی ٹانگ اس جگہ رکھی جہاں میں ہمیشہ گیند پھینکتا ہوں۔" بولر نے الزام لگایا۔

"بکواس ہے۔ بات یوں ہے کہ اس نے جان بُوجھ کر اس جگہ گیند پھینکی جہاں میں ہمیشہ اپنی ٹانگ رکھتا ہوں۔" مرزا نے جواب دیا۔

"اگر میرا نشانہ ایسا ہی ہوتا تو مرزا جی کبھی کے پویلین میں براجمان ہوتے۔" بولر بولا۔

"تو یوں کہو کہ تمہاری گیند وکٹ سے الرجک ہے۔" مرزا نے کہا۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مرزا نے عمداً ٹانگ آگے کی۔" یک چشم بولر نے حلفیہ کہا۔

امپائر نے دونوں کو سمجھایا کہ بحثا بحثی کرکٹ کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ پھر یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ بیٹس مین کے کھیل کے محتاط اسٹائل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اسے ذرا بھی احتمال ہوتا کہ گیند اس کی ٹانگ کی طرف آرہی ہے تو یہ کھٹاک سے وکٹ کو اپنی ٹانگ کے آگے کر دیتا۔

اس فیصلہ پر مرزا نے اپنی ٹوپی اُچھالی اور جب وہ اپنے مرکز کی طرف واپس آگئی تو پھر کھیل شروع ہوا۔ لیکن دُوسرے ہی اوور میں بولر نے گیند ایسی کھینچ کے ماری کہ مرزا کے سر سے ایک آواز (اور منہ سے کئی!) نِکلی اور ٹوپی اُڑ کر وکٹ کیپر کے قدموں پر جا پڑی۔

جب امپائر نے مرزا کو ٹوپی پہنانے کی کوشش کی تو وہ ایک اِنچ تنگ ہو چکی تھی!

اس کے باوجود مرزا خُوب جم کے کھیلے۔ اور ایسا جم کے کھیلے کہ ان کی اپنی ٹیم کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس اجمالِ پُر ملال کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے ہی ان کا ساتھی گیند پر ہِٹ لگاتا ویسے ہی مرزا سے رَن بنانے کی پُرزور دعوت دیتے اور جب وہ کشاں کشاں ۳/۳ پچ طے کر لیتا تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر، بلکہ دھکیل کر، اپنے وکٹ کی جانب واپس بھیج دیتے۔ مگر اکثر یہی ہوا کہ گیند اس غریب سے پہلے وہاں پہنچ گئی۔ اور وہ مفت میں رَن آؤٹ ہو گیا۔ جب مرزا نے یکے بعد دیگرے اپنی ٹیم کے پانچ کھلاڑیوں کا، بشمول کپتان ذی شان، اس طرح جلوس نکال دیا تو کپتان نے پسماند گان کو سختی سے تنبیہہ کر دی کہ خبر دار! اب مرزا کے علاوہ کوئی رَن نہ بنائے۔

لیکن مرزا آخری وکٹ تک اپنی وضع احتیاط پر ثابت قدمی سے قائم رہے اور ایک رَن بنا کے نہیں دیا۔ اس کے باوجود ان کا سکور اپنی ٹیم میں سب سے اچھا رہا۔ اس لیے کہ رَن تو کسی اور نے بھی نہیں بنائے، مگر وہ سب آوٹ ہو گئے۔ اس کے برعکس مرزا خود کو بڑے فخر کے ساتھ "زیرو ناٹ آؤٹ" بتاتے تھے۔ ناٹ آؤٹ! اور یہ بڑی بات ہے۔

کھیل کے مختصر وقفے کے بعد طویل لنچ شروع ہُوا۔ جس میں بعض شادی شدہ افسروں نے چھک کے بیئر پی اور اُونگھنے لگے۔ جنہوں نے نہیں پی، وہ ان کی بیویوں سے بدتمیزیاں کرنے لگے۔ جب چائے کے وقت میں کُل دس منٹ باقی رہ گئے اور بیرے جھپاک جھپاک پیالیاں لگانے لگے تو مجبوراً کھیل شروع کرنا پڑا۔ دو کھلاڑی امپائر کو سہارا دے کر پچ تک لے گئے اور مرزا نے بولنگ سنبھالی۔ پتہ چلا کہ وہ بولنگ کی اس نایاب صنف میں یدِ طُولیٰ رکھتے ہیں جسے ان کے بدخواہ "وائڈ بال" کہنے پر مُصر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹ لگے بغیر بھی دھڑا دھڑ رن بننے لگے۔ تین اوور کے بعد یہ حال ہو گیا کہ مرزا ہر گیند پر گالی دینے لگے۔ (شکار میں بھی ان کا سدا سے ہی دستور رہا کہ فیر کرنے سے پہلے دانت پیس کر تیتر کو کوستے ہیں اور فیر کرنے کے بعد بندوق بنانے والے کارخانے کو گالیاں دیتے ہیں)۔

ہم بولنگ کی مختلف قسموں اور باریکیوں سے واقف نہیں تاہم اتنا ضرور دیکھا کہ جس رفتار سے مرزا وکٹ کی طرف گیند پھینکتے، اس سے چوگنی رفتار سے واپس کر دی جاتی۔ وہ تھوڑی دیر کج رفتار گیند کو حیرت اور حسرت سے دیکھتے۔ بار بار اس پر اپنا دایاں کفِ افسوس ملتے۔ پھر بھَدر بھَدر دوڑتے اور جب اور جہاں سانس بھر جاتی وہیں اور اسی لمحے لُنجے ہاتھ سے گیند پھینک دیتے۔

مُنہ پھیر کر اِدھر کو اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ

ابتدا میں تو مخالف ٹیم ان کی بولنگ کے معیار سے نہایت مطمئن و محظوظ ہوئی۔ لیکن جب اس کے پہلے ہی کھلاڑی نے پندرہ منٹ میں تیس رن بناڈالے تو کپتان نے اصرار کیا کہ ہمارے دوسرے بیٹس مین رہے جاتے ہیں۔ ان کو بھی موقع ملنا چاہیے۔ اس لیے آپ اپنا باؤلر بدلئے۔

مرزا بولنگ چھوڑ کر پویلین میں آ گئے۔ مارے خوشی کے کانوں تک باچھیں کھِلی پڑ رہی تھیں۔ جب وہ اپنی جگہ پر واپس آ گئیں تو مُنہ ہمارے کان سے بھِڑا کر بولے۔

"کہو پسند آئی؟"

"کون؟ کدھر؟" ہم نے پوچھا۔

ہمارا ہاتھ جھٹک کر بولے "نِرے گاؤدی ہو تم بھی۔ مَیں کرکٹ کی اسپرٹ کی بات کر رہا ہُوں۔"

صنفِ لاغر

سنتے چلے آئے ہیں کہ آم گلاب اور سانپ کی طرح عورتوں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آم اور گلاب کی قسم کا صحیح اندازہ کاٹنے اور سُونگھنے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اگر مار گزیدہ مر جائے تو سانپ کی قسم کا پتہ چلانا بھی چنداں دشوار نہیں، لیکن آخر الذّکر خالص مُشک کی طرح اپنی قسم کا خود اعلان کر دیتی ہے۔ ایک بزرگوار جنہوں نے اپنی عمر اور کمائی ریس کورس اور "طوائف کوئے ملامت" میں گنوائی ہے۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ گھوڑے اور عورت کی ذات کا اندازہ اس کی لات اور بات سے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کے مقولوں کی حیثیت ہارے ہوئے جواری کی لفظی پھلجھڑیوں سے زیادہ نہیں جو فضا کو روشن کریں یا نہ کریں، آنکھوں میں کچھ دیر کے لیے ضرور چکا چوند پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر اس کے بعد تاریکی کچھ اور زیادہ تاریک معلوم ہوتی ہے۔ گھوڑے اور سانپ کے خصائل کی تصدیق یا تردید کا حق ویسے تو سالوتریوں اور سپیروں کو پہنچتا ہے یا پھر ان حضرات کو جو ڈسے جا چکے ہیں یا دُلتّی کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں،

لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ ثمرِ ممنوعہ اگر سانپ کے پھن پر بھی رکھا ہوتا تو وہاں بھی آدم کے حریص ہونٹ بے دھڑک اسے چُوم لیتے۔

خیر یہ تو جُملہ معترضہ تھا۔ بات قسموں کی ہو رہی تھی اور ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ آج کل عورتوں کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو موٹی ہیں۔ دُوسرے وہ جو دُبلی نہیں ہیں۔ آپ کہیں گے ''آخر دونوں میں فرق کیا ہُوا؟'' یہ تو وہی الف دو زبر اً اور الف نون زبر اَن والی بات ہوئی۔ مگر آپ یقین جانیے کہ دونوں قسموں میں پتلے ہونے کی خواہش کے علاوہ اور کوئی بات مشترک نہیں۔ ان کے حدود اربعہ خدوخال اور نقوش جُدا جُدا ہیں اور اس میں کاتبِ تقدیر کی کسی املا کی غلطی کا قطعاً کوئی شائبہ تک نہیں۔ اصل فرق یہ ہے کہ اوّل الذّکر طبقہ (جو صحیح معنوں میں ایک فرقہ کی حیثیت رکھتا ہے) کھانے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ دوسرا طبقہ زندہ رہنے کے لئے کھاتا ہے۔ پہلا طبقہ دوا کو بھی غذا سمجھ کر کھاتا ہے اور دوسرا طبقہ غذا کو بھی بقدر دوا استعمال کرتا ہے۔ ایک کھانے پر جان دیتا ہے اور دوسرا کھانے کو دوڑتا ہے۔ وعلیل ہذا القیاس۔ فرق باریک ضرور ہے لیکن اگر آپ نے کبھی فن برائے فن، زندگی برائے فن، فن برائے زندگی اور زندگی برائے زندگی وغیرہ کی بحث سُنی ہے تو یہ فرق بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔ اس

مضمون میں رُوئے سُخن دوسرے طبقہ سے ہے جو دُبلا نہیں ہے، مگر دُبلا ہونا چاہتا ہے۔

زمانہ قدیم میں ایران میں نسوانی حُسن کا معیار چالیس صفات تھیں (اگرچہ ایک عورت میں ان کا یکجا ہونا ہمیشہ نقصِ امن کا باعث ہُوا) اور یہ مشہور ہے کہ شیریں ان میں سے انتالیس صفات رکھتی تھی۔ چالیسویں صفت کے بارے میں مؤرخین متفقہ طور پر خاموش رہیں۔ لہٰذا گمان غالب ہے کہ اس کا تعلّق چال چلن سے ہو گا۔ اُس زمانے میں ایک عورت میں عموماً ایک ہی صفت پائی جاتی تھی۔ اِس لئے بعض بادشاہوں کو بدرجۂ مجبوری اپنے حرم میں عورتوں کی تعداد بڑھانا پڑی۔ ہر زمانے میں صفات زنانہ لباس کی طرح، سکڑتی، سمٹتی اور گھٹتی رہیں۔ بالآخر صفات تو غائب ہو گئیں، صرف ذات باقی رہ گئی۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ ذات وصفات کی بحث سے قطعِ نظر، یہی کیا کم ہے کہ عورت صرف عورت ہے۔ ورنہ وہ بھی مرد ہو جاتی تو ہم کی بگاڑ لیتے؟

آج کا کھاتے پیتے گھرانوں میں دُبلے ہونے کی خواہش ہی ایک ایسی صفت ہے جو سب خوبصورت لڑکیوں میں مشترک ہے۔ اس خواہش کی محرک دورِ جدید کی ایک جمالیاتی دریافت ہے، جس نے تندرستی کو ایک مرض قرار دے کر

بدصورتی اور بد ہئیتی سے تعبیر کیا ہے۔ مردوں کی اتنی بڑی اکثریت کر اس رائے سے اتفاق ہے کہ اس کی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ جہاں یرقان حُسن کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو جائے اور چشمِ بیکار و تنِ لاغر حُسن کا معیار بن جائیں وہاں لڑکیاں اپنے تندرست و توانا جسم سے شرمانے اور بدن چُرا کر چلنے لگیں تو تعجّب نہیں ہونا چاہیے۔ یوں سمجھئے کہ حوّا کی جیت کا راز آدم کی کمزوری میں نہیں بلکہ خود اس کی اپنی کمزوری میں مضمر ہے۔ اگر آپ کو یہ نچڑے ہوئے دھان پان بدن، ستے ہوئے چہرے اور سُوکھی باہنیں پسند نہیں تو آپ یقیناً ڈاکٹر ہوں گے۔ ورنہ اہلِ نظر تو اب چہرے کی شادابی کو ورم، فربہی کو جلندھر اور پنڈلی کے سڈول پن کو "فیل پا" گردانتے ہیں!

آج بھی فرہاد کے ہاتھ میں تیشہ ہے، مگر یہ تیشہ محمود ہے! یا یوں کہئے کہ جب سے بُت شکن نے بُت پرستی اور بُت تراشی اختیار کی، حُسن کا معیار ایسا بدلا کہ جب تک قدیم یونانی مجسموں کے پیچ و خم اور اُبھار کو رندے لگا کر بلیرڈ کی میز کی طرح سپاٹ نہ کر دیا جائے یہ آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ اجنتا کی تصویریں اور مائیکل انجلو کے مجسمے بھی اسی سلوک یا بدسلوکی کے سزاوار ہیں کہ ان میں بھی ایک ایسے بھرپور بدن کے خطوط کو اُبھارا گیا ہے جو اپنے آپ سے شرمندہ نہیں، لیکن جس

کی تاب مضمحل بازو اور تھکے ہُوئے اعصاب نہیں لا سکتے۔ اس پر عہدِ مُغلیہ کے مشہور شاعر بہاری کا یہ دوہا صادق آتا ہے:

اپنے انگ کے جان کے، یووَن نرپت پروین

ستن، من، نین، نِمب کو بڑوِ اجا پھا کین

یعنی اپنے رُوپ کا انگ جان کر جوانی کے ذہین بادشاہ نے سینہ، دل، آنکھوں اور کولھوں میں بڑا اضافہ کیا۔ دیکھا گیا ہے کہ جوانی کا ذہین بادشاہ بسا اوقات ان ضائع بدائع کے استعمال میں فیاضی سے کام لیتا ہے جس کے باعث جمالِ خود رَو کی قطع و برید لازم آتی ہے۔ شکر ہے کہ اب حُسن خُود کو بڑی حد تک ان حشو وزوائد سے پاک کر چکا ہے۔ اب عورت اقلیدس کے خطِ مستقیم کی مانند ہے جس میں طول ہے عرض نہیں۔

تاہم بعض رجعت پسندوں کے نزدیک اب بھی مثالی اور متناسب جسم وہ ہے جس میں مندرجہ بالا چار عناصر میں سے پہلے اور چوتھے کا محیط برابر ہو۔ اور کمر کا ناپ اِن دونوں سے پندرہ سولہ انچ کم۔ مثلاً ۳۷-۲۱-۳۷ انچ کی ایکٹرس کے جسم کی اس سے بہتر کوئی تعریف نہیں ہو سکتی کہ اسے انگریزی کے 8 کے ہندسے سے

تشبیہ دی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ۲۴ سال کے سن میں جو خواتین ۸ کا ہندسہ نظر آتی ہیں وہ ۴۲ سال کی عمر میں دو چشمی ھ بن جائیں!

اگلے وقتوں کے لوگوں کے قویٰ بالعموم ان کے ضمیر سے زیادہ قوی ہوتے تھے۔ اس زمانے میں یہ عقیدہ عام تھا کہ دانا مرد عورتوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے صنفِ نازک کے باب میں ان کا نظریہ کم و بیش وہی تھا جو مرزا غالب کا آم کے متعلق۔۔۔ یعنی یہ کہ بہت ہوں! لیکن اب یہ حال ہے کہ جب تک اچھی طرح ناپ تول نہ کر لی جائے کسی کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا۔ بدن کی ناپ تول کا حق پہلے صرف درزی اور گورکن کو حاصل تھا مگر اب دنیا کی ہر خوبصورت عورت کا جغرافیہ جس میں وزن اور محرم کا سائز نمایاں ہیں، معلوماتِ عامہ کا جزو بن گیا ہے اور بلاشُبہ یہ جزو ہے جو کل پر بھاری ہے۔

وزن حسن کا دشمن ہے۔ (یاد رکھیئے رائے کے علاوہ ہر وزنی چیز گھٹیا ہوتی ہے) اس لیے ہر سمجھدار عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی چربی کی دبیز تہوں کے خول کو سانپ کی کینچلی کی طرح اُتار کر اپنی عزیز سہیلیوں کو پہنا دے۔ عقدِ ناگہانی کے بعد کہ جس سے کسی کو مفر نہیں ہر لڑکی کا بیشتر وقت اپنے وزن اور شوہر سے جنگ کرنے میں گزرا ہے۔ جہاں تک زن و شوہر کی جنگ کا تعلق ہے ہم نہیں

کہہ سکتے کہ شہید کون ہوتا ہے اور غازی کون؟ لیکن زن اور وزن کی جنگ میں پلّہ فریقِ اوّل ہی کا بھاری رہتا ہے۔ اس لیے جیت فریقِ ثانی کی ہوتی ہے۔ موٹاپے میں ایک خرابی یہ ہے کہ تمام عمر کو گلے کا ہار ہو جاتا ہے۔ اور بعض خواتین گھر کے اندیشوں اور ہمسایوں کی خوشحالی سے بھی دُبلی نہیں ہوتیں:

"تن" کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں

دراصل گرہستی زندگی کی آب و ہوا ہی ایسی معتدل ہے کہ مولسری کا پھول دو تین سال میں گوبھی کا پھول بن جائے تو عجب نہیں۔

مٹاپا عام ہو یا نہ ہو، مگر دُبلے ہونے کی خواہش جتنی عام ہے اتنی ہی شدید بھی۔ آئینے کی جگہ اب وزن کرنے کی مشین نے لے لی ہے۔ بعض نئ مشینیں تو ٹکٹ پر وزن کے ساتھ قسمت کا حال بھی بتاتی ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ عورتوں کی قسمت کے خانے میں صرف ان کا وزن لکھا ہوتا ہے۔ عورتوں کو وزن کم کرنے کی دواؤں سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی ادھیڑ عمر مردوں کو یونانی دواؤں کے اشتہاروں سے۔ اگر یہ دلچسپی ختم ہو جائے تو دواؤں کے کارخانوں کے ساتھ، بلکہ ان سے کچھ پہلے وہ اخبارات بھی بند ہو جائیں جن میں یہ اشتہارات نکلتے ہیں۔ اگر آپ کو آسکر وائلڈ کی رائے سے اتّفاق ہے کہ آرٹ کا اصل مقصد قدرت کی

خام کاریوں کی اصلاح اور فطرت سے فی سبیل اللہ جہاد ہے تو لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ ہر بد صورت عورت آرٹسٹ ہے۔ اس لیے ہوش سنبھالنے کے بعد اس کی ساری تگ و دو کا منشا سیاہ کو سفید کر دکھانا، وزن گھٹانا اور ہر سالگرہ پر ایک موم بتّی کم کرنا ہے۔ عمر کی تصدیق تو شاید بلدیہ کے رجسٹر پیدائش و اموات سے کی جا سکتی ہے لیکن ایک دوسرے کے وزن کے متعلق بھاری سے بھاری بہتان لگایا جا سکتا ہے۔ رائی کا پہاڑ اور گرمی دانے کا مَسّا بنانا لُتری عورتوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ عورت جسے خود اپنی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر نہیں آتے، دوسرے کی جھائیوں پر بے جھجک اپنی بڑھے ہوئے ناخن والی انگلی اٹھاتے وقت یہ بھُول جاتی ہے کہ ہر گل کے ساتھ خار اور ہر منہ پر مہاسا ہوتا ہے۔

عورتیں فطرتاً بہت راسخ العقیدہ ہوتی ہیں اور اپنے بنیادی عقائد کی خاطر عمر بھر سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کر لیتی ہیں۔ مثلاً سات نمبر پاؤں میں پانچ نمبر کا جوتا۔ وزن کم کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتیں۔ غسلِ آفتابی، جاپانی مالش، یونانی جلاب، انگریزی کھانا، چہل قدمی، ورزش، فاقہ ۔۔۔ پہلے چہل قدمی کو لیجیے کہ امرت دھارا کی طرح یہ ہر مرض کی دوا ہے۔ سوکھے ساکھے مرد اپنا وزن بڑھانے اور عورتیں اپنا وزن گھٹانے کے لیے ٹہلتی ہیں۔

جس طرح چائے گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور سردی میں حدّت، اسی طرح چہل قدمی دُبلے کو موٹا اور موٹے کو دُبلا کرتی ہے۔ اگر ہماری طرح آپ کو بھی الفنسٹن اسٹریٹ پر ٹہلنے کا شوق ہے تو آپ نے بعض میاں بیوی کو ان مختلف بلکہ متضاد عزائم کے ساتھ پابندی سے "ہواخوری" کرتے دیکھا ہو گا۔ عورتوں کا انجام ہمیں معلوم نہیں لیکن یہ ضرور دیکھا ہے کہ بہت سے "ہواخور" رفتہ رفتہ "حوّاخور" ہو جاتے ہیں۔

جو عورتیں دواؤں سے پرہیز کرتی ہیں وہ صرف ورزش سے خود کو "سلم" رکھ سکتی ہیں۔ "سِلمنگ" کے موضوع پر عورتوں کی رہبری کے لیے بے شمار باتصویر کتابیں مِلتی ہیں۔ جن کے مضامین عورتیں پڑھتی ہیں اور تصویروں سے مرد جی بہلاتے ہیں۔ ان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ مرد کاٹھ کے پتلے کی مانند ہے لیکن عورت موم کی طرح نرم ہے۔ چنانچہ مرد کو ہر سانچے میں ڈھال سکتی ہے۔ پھر اس کے اپنے گوشت پوست میں قدرت نے وہ لوچ رکھا ہے کہ

سمٹے تو دِل عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے

چنانچہ ہر عضوِ بدن کے لیے ایک علیٰحدہ ورزش ہوتی ہے۔ مثلاً دوہری ٹھوڑی کو اکہری کرنے کی ورزش ۵۱ انچ کو ۱۵ انچ بنانے کی کسرت۔ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر

غذا ہضم کرنے کی ترکیب، شرعی عیوب کا ہپناٹزم سے علاج وغیرہ۔ توند کے لیے ماہرین کا خیال ہے کہ سیاست دان کے ضمیر کی مانند ہے۔ اس کی لچک کو ذہن نشین کرانے کی غرض سے وہ اکثر اسے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے وقت سے تشبیہ دیتے ہیں جس کے متعلق یہ کہہ گئے ہیں کہ

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ

کھینچنے سے کھنچتی ہے، چھوڑے سے جاتی ہے سُکڑ

حق تو یہ ہے کہ جدید سائنس نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ دماغ کے علاوہ جسم کا ہر حصّہ حسبِ منشا گھٹایا یا بڑھایا جاسکتا ہے۔

یہی حال عورتوں کے رسالوں کا ہے۔ ان کے (رسالوں کے) تین ٹکڑے کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل آزادیٔ اطفال اور شوہر کی تربیت و نگہداشت۔ دوم، کھانا پکانے کی ترکیبیں۔ سوم، کھانا نہ کھانے کی ترکیبیں۔ ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشخیص سب کی ایک ہی ہے۔ بس نسخے مختلف ہیں۔ پرہیز بہر صُورت یکساں! اس امر پر سب متفق ہیں کہ افزائشِ حُسن کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایسی غذا کھائی جائے جس سے خونِ صالح پیدا نہ ہو اور جو جزوِ بدن نہ ہو سکے۔ ہماری رائے میں کِسی پڑھی لکھی عورت کے لیے اس سے سخت اور کون سی سزا ہو سکتی ہے کہ

اسے چالیس دن تک اس کے ہاتھ کا پکا ہُوا کھانا کھلایا جائے۔ دُبلے ہونے کا اس سے بہتر اور زود اثر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

رسالوں کے اس حصّے میں تاریخی ناولوں کا چٹخارا اور یونانی طِب کی چاشنی ہوتی ہے اس لیے نہایت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ چند عنوانات اور ٹوٹکے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

زلیخا حضرت یوسف کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے دوبارہ جوان ہُوئی! قلوپطرہ کے نازک اندام ہونے کا راز یہ ہے کہ وہ نہار منہ مصری تربوز کا پانی اور رعیت کا خُون پیتی تھی۔ ملکہ الزبتھ اس لیے دُبلی تھی کہ میری آف سکاٹ نے اس کا موم کا پُتلا بنا رکھا تھا، جس میں وہ چاندنی رات میں سوئیاں چبھویا کرتی تھی۔ کیتھرین ملکۂ روس کے "سلم" ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ رات کو روغنِ قاز مل کر سوتی تھی۔ ملکہ نور جہاں بینگن پر جان دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ بینگن کے سر پر بھی تاج ہوتا ہے بلکہ اس میں کوئی پروٹین نہیں ہوتی۔ ملکہ ممتاز محل اور تاج محل کی خوبصورتی کا راز ایک ہی ہے۔۔۔ سفید رنگ! ایکٹرس آڈرے، ہیپ برن اس لیے موٹی نہیں ہوتی کہ وہ ناشتے میں نشاستے سے پرہیز کرتی ہے اور پھیکی چائے پیتی ہے جس سے چربی پگھلتی ہے۔

چائے کی پتّی سے گھٹ سکتا ہے عورت کا شکم

دُبلے آدمی کینہ پرور سازشی اور دغاباز ہوتے ہیں۔ یہ ہماری نہیں بلکہ جولیس سیزر کی رائے ہے جس نے ایک مریل سے درباری کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے قول کو سچّا کر دکھایا۔ گو کہ ہمارے موزے کا سائز صرف سات اور بیان کا چونیتس ہے۔ لیکن ہمیں بھی اس نظریہ سے اتفاق ہے کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ موٹی عورتیں فطرتاً ملنسار ہنس مکھ اور صلح پسند ہوتی ہیں۔ وہ نہ خود لڑتی ہیں اور نہ مرد ان کے نام پر تلوار اُٹھاتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی صاحب اس کا یہ جواز پیش کریں کہ چونکہ ایسی گج گامنی کی نقل و حرکت بغیر جرِّ ثقیل کے ممکن نہیں لہٰذا وہ نہ ڈٹ کر لڑ سکتی ہیں اور نہ میدان چھوڑ کر بھاگ سکتی ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آج تک کسی موٹی عورت کی وجہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

خدانخواستہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم حُسن میں ہارس پاور کے متلاشی ہیں اور اکھاڑے کی رونق کو چھپّر کھٹ کی زینت بنانے کی سفارش کر رہے ہیں۔ ہمارے ذہن میں حسن بے پرواکا یہ سراپا نہیں کہ ہر خط بدن ایک دائرہ بنارہا ہے۔ پیٹ پر ٹائر بندھا ہوا ہے چہرے سے لگتا ہے کہ ابھی ابھی بھڑوں نے کاٹا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اس بے چاری کا سینہ ارمانوں کا مدفن ہے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ

مرحومین کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی۔ کھُلے ہوئے گلے کے بلاؤز کا یہ عالم کہ کوئی شیر خوار بچّہ دیکھ پائے تو بِلبِلا اُٹھے۔ تنگ پوشی کا یہ حال کے کوزے میں دریا بلکہ پہاڑ بند۔ ٹانگیں جیسے بوڑھے ہاتھی کی سونڈ جن پر غرارہ بھی چوڑی دار پاجامہ معلوم ہوتا ہے۔

ایسی ہی چوڑی چکلی خاتون کا لطیفہ ہے کہ انہوں نے بس ڈرائیور سے بڑی لجاجت سے کہا "بھیا! ذرا مجھے بس سے اُتروا دے۔" ڈرائیور نے مُڑ کر دیکھا تو اس کا چہرہ فرشتوں کی طرح تمتما اُٹھا۔ ان فرشتوں کی طرح جنہوں نے بارِ خلافت اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر خود ہی بولیں "میری عادت ہے کہ دروازے سے اُلٹی اُترتی ہوں مگر تمہارا اُلٹی کھوپڑی کا کنڈکٹر سمجھتا ہے کہ چڑھ رہی ہوں اور ہر دفعہ زبردستی اندر دھکیل دیتا ہے۔ تین اسٹاپ نِکل گئے۔"

ہم یہاں یہ پرچار نہیں کر رہے کہ حُسن اور وزن میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے کہ اب خود اس مثالی رشتے کے بند ٹوٹ چکے ہیں۔ ہم تو صرف قارئین کرام کو اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ تندرستی کوئی لاعلاج مرض نہیں ہے۔ ہمیں کمزوری میں، جب تک وہ اخلاقی نہ ہو، بظاہر کوئی دل کشی نظر نہیں آتی۔ اس طرح فاقہ کشی صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔۔۔۔ کسی شرعی ضرورت سے یا

بطور ستیہ گرہ۔ مگر وزن گھٹانے کی غرض سے جو فاقہ کشی کی جاتی ہے اس کی محرک کوئی روحانی حاجت یا سیاسی مصلحت نہیں بلکہ خدائے مجازی کی پسند ہے۔ اس پیکرِ تصویر کے خطوط کی بے کیف سادگی اور پھیکا پن مرد کے عجزِ تصوّر کے فریادی ہیں۔ یہ کہنا تو زیادتی ہو گی کہ حُسن بیمار کے پیچھے ایک چھکے چھکائے تھکے ہوئے حُسن پرست کی جنسی اکتاہٹ کارفرما ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مرد کی پسندیدہ وہ پُل صراط ہے جس پر کوئی موٹی عورت نہیں چل سکتی۔

موسموں کا شہر

انگریزوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ طبعاً کم گو واقع ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ فقط کھانے اور دانت اُکھڑ وانے کے لیے مُنہ کھولتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر انگلستان کا موسم اتنا واہیات نہ ہوتا تو انگریز بولنا بھی نہ سیکھتے اور انگریزی زبان میں کوئی گالی نہ ہوتی۔ کم و بیش یہی حال ہم اہالیانِ کراچی کا ہے۔ میں اپنے شہر کی بُرائی کرنے میں کوئی بڑائی محسوس نہیں کرتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جو شخص کبھی اپنے شہر کی بُرائی نہیں کرتا وہ یا تو غیر ملکی جاسوس ہے یا میونسپلٹی کا بڑا افسر۔ یوں بھی موسم، معشوق اور حکومت کا گِلہ ہمیشہ سے ہمارا قومی تفریحی مشغلہ (Indoor Pastime) رہا ہے۔ ہر آن بدلتے ہوئے موسم سے جس درجہ شغف ہمیں ہے اس کا اندازہ یوں لگایئے کہ یہاں بہت سے نجومی ہاتھ دیکھ کر آئندہ چوبیس گھنٹوں کے موسم کی پیشین گوئی کرتے ہیں اور الغاروں کماتے ہیں۔

اب سے چند مہینے پہلے تک بعض گرم و سرد چشیدہ سیاست دان خرابیٔ موسم کو آئے دن کی وزارتی ردّوبدل کا ذمّہ دار ٹھیراتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کراچی کا موسم بھی انگریز ہی کی ایک چال ہے۔ لیکن موسم گزیدہ عوام کو یقین ہو چلا تھا کہ درحقیقت وزارتی ردّوبدل کے سبب یہاں کا موسم خراب ہو گیا ہے۔

نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو موسم کی برائی تہذیبِ اخلاق کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ اگر موسم کو بُرا بھلا کہہ کر دل کا غُبار نکالنا شہری آداب میں داخل نہ ہوتا تو لوگ مجبوراً ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگتے۔

اِس میں شک نہیں کہ ریڈیو کی گڑگڑاہٹ ہو یا دمہ، گنج ہو یا پاؤں کی موچ، ناف ٹلے یا نکسیر پھوٹے، ہمیں یہاں ہر چیز میں موسم کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلغمی مزاج والا سیٹھ ہو یا سودائی فنکار، ہر شخص اسی بُت ہزار شیوہ کا قتیل ہے۔ کوئی خرابی ایسی نہیں جس کا ذمّہ دار آب و ہَوا کو نہ ٹھہرایا جاتا ہو (حالانکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کو خرابیٔ صحت کی وجہ سے موسم خراب لگتا ہے)۔ ایک صاحب کو جانتا ہوں جنہیں عرصہ سے بنولے کے سٹّہ کا ہوکا ہے۔ وہ بھی کراچی کی مرطوب آب و ہَوا ہی کو اپنے تین دِوالوں کا ذمّہ دار قرار دیتے ہیں۔ ایک اور بزرگ کا دعویٰ ہے کہ میں اپنی بتّیسی اسی نامعقول آب و ہَوا کی نذر کر چکا ہوں۔

دیکھنے میں یہ بات عجیب ضرور لگتی ہے مگر اپنے مشاہدے کی بنا پر کہتا ہوں کہتا ہوں کہ اس قسم کی آب و ہَوا میں چائے اور سٹّہ کے بغیر تندرستی قائم نہیں رہ سکتی۔

اور تو اور چالان ہونے کے بعد اکثر پنساری اپنی بے ایمانی کو ایمائے قدرت پر محمول کرتے ہوئے اپنی صفائی میں کہتے ہیں کہ "حضور! ہم موسم کی خرابی کی وجہ سے کم تولتے ہیں۔۔۔ سیلن سے جِنس اور دالوں کا وزن دُگنا ہو جاتا ہے اور زنگ کھا کھا کر باٹ آدھے رہ جاتے ہیں۔ نتیجے میں گاہک کو ۱/۴ سودا مِلتا ہے! ہم بالکل بے قصور ہیں۔"

اور ایک کفایت شعار خاتون (جنھوں نے پچھلے ہفتے اپنی ۳۲ ویں سالگرہ پر ۲۳ موم بتیاں روشن کی تھیں) اکثر کہتی ہیں کہ دس سال پہلے میں گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی رہتی تھیں۔ لیکن یہاں کی آب و ہَوا اتنی واہیات ہے کہ اب بے خبری میں آئینے پر نظر پڑ جاتی ہے تو اس کی کو الٹی پر شبہ ہونے لگتا ہے۔

لیکن غصّہ ان حضرات پر آتا ہے جو بے سوچے سمجھے یہاں کے موسم پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس کی وضاحت نہیں فرماتے کہ انہیں کونسا موسم ناپسند ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ کراچی میں موسم ہر لحظہ روئی کے بھاؤ کی طرح بدلتا رہتا ہے۔

ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک ہی عمارت کے کرایہ دار ایک منزل سے دوسری منزل پر تبدیل آب و ہَوا کی غرض سے جاتے ہیں۔ یہاں آپ دسمبر میں ململ کا کُرتا یا جون میں گرم پتلون پہن کر نکل جائیں تو کِسی کو ترس نہیں آئے گا۔ اہلِ کراچی اس واللہ اعلم بالصّواب قسم کے موسم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر یہ دو تین گھنٹے تبدیل نہ ہو تو وحشت ہونے لگتی ہے اور بڑی بوڑھیاں اس کو قربِ قیامت کی نشانی سمجھتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اچھے خاصے لحاف اوڑھ کر سوئے اور صبح پنکھا جھلتے ہوئے اٹھے۔ یا محکمہ موسمیات کی پیش گوئی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے صبح برساتی لے کر گھر سے نکلے اور دوپہر تک لُو لگنے کے سبب بالا ہی بالا اسپتال میں داخل کروا دیئے گئے۔ کہاں تو رات کو ایسی شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی کہ چارپائی کی چُولوں کے کھٹمل گِن لیجیے اور کمال صُبح دس بجے کُہرے کا یہ عالم کہ ہر بَس ہیڈ لائٹ جلائے اور اوس سے بھیگی سڑک پر خربوزے کی پھانک کی طرح پھسل رہی ہے۔ بعض اوقات تو یہ کُہرا اتنا گہرا ہوتا ہے کہ نوواردوں کو کراچی کا اصل موسم نظر نہیں آتا۔

موسم کے تلوّن کی یہ کیفیت ہے کہ دن بھر کے تھکے ہارے پھیری والے شام کو گھر لوٹتے ہیں تو بغیر استخارہ کیے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ صبح اُٹھ کر بھوبل کی بھُنی گرما گرم مونگ پھلی بیچیں یا آئس کریم!

کراچی کے باشندوں کو غیر ملکی سیر و سیاحت پر اکسانے میں آب و ہَوا کو بڑا دخل ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انگلستان کا موسم اگر اتنا ظالم نہ ہوتا تو انگریز دوسرے ملکوں کو فتح کرنے ہر گز نہ نکلتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ محض میری صحت دیکھ کر یہاں کی آب و ہَوا سے بد ظن ہو جائیں لیکن اطلاعاً اتنا ضرور عرض کروں گا کہ مقامی چڑیا گھر میں جو بھی نیا جانور آتا ہے، کچھ دن یہاں کی بہارِ جانفزا دیکھ کر میونسپل کارپوریشن کو پیارا ہو جاتا ہے اور جو جانور بچ جاتے ہیں، اُن کا تعلّق اس مخلوق سے ہے جس کو طبعی موت مرتے کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ مثلاً مگر مَچھ، ہاتھی، میونسپلٹی کا عملہ !

ہم نے کراچی کے ایک قدیم باشندے سے پوچھا کہ یہاں مانسون کا موسم کب آتا ہے؟ اس بزرگ باراں دیدہ نے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے جواب دیا کہ چار سال پہلے تو بُدھ کو آیا تھا!

یہ کہنا تو غلط ہو گا کہ کراچی میں بارش نہیں ہوتی۔ البتہ اس کا کوئی وقت اور پیمانہ معین نہیں ہے لیکن جب ہوتی ہے تو اس انداز سے گویا کسی مست ہاتھی کو زکام ہو گیا ہے۔ سال کے بیشتر حصّہ میں بادلوں سے ریت برستی رہتی ہے۔ لیکن جب چھٹے چھما ہے دو چار چھینٹے پڑ جاتے ہیں تو چٹیل میدانوں میں بیر بہوٹیاں اور بہو

بیٹیاں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے نِکل پڑتی ہیں۔ اس قسم کا موسم بے تحاشا "رش" لیتا ہے۔

مغربی پاکستان میں برکھارُت اور کراچی میں جولائی کا مہینہ تھا۔ سمت کیماڑی سے مکھّیوں کے دل بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے تھے۔ چنانچہ میں مچھر دانی مَیں بیٹھا آم چُوس رہا تھا کہ مرزا عبدالودود بیگ آ نکلے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ لا حول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی موسم ہے۔۔۔ جیسے کسی اقبالی مجرم کو ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے ہوں۔ ادھر کم بخت مکھّیاں اِس قدر لدھڑ ہو گئی ہیں کہ اُڑنے کا نام نہیں لیتیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ واقعہ ہے کہ صبح قصائی نے میرے سامنے آدھ سیر ران کا گوشت تول کر قیمہ کوٹا۔ میں برابر پنکھا جھلتا رہا۔ لیکن گھر پر بیگم نے تولا تو پورا تین پاؤ نکلا!

وہ انگریزی فلمیں جن میں بارش کے مناظر ہوتے ہیں کراچی میں خوب کامیاب ہوتی ہیں۔ جغرافیہ پڑھنے والے بچّے انہیں خود دیکھتے ہیں اور اپنے والدین کو دِکھاتے ہیں۔ صاحبِ استطاعت والدین اپنے بچّوں کو بارش کا مطلب سمجھانے کے لئے راولپنڈی لے جاتے ہیں اور انہیں وہ ہرے بھرے لان بھی دکھاتے ہیں جن پر پانی روپے کی طرح بہایا جاتا ہے۔ جو صاحبِ اولاد اس لائق نہیں

ہوتے وہ اپنے بچّوں کی انگلی پکڑ کر کلفٹن کے ساحل پر لے جاتے ہیں اور اپنی عینک رومال سے صاف کرتے ہوئے انہیں سمجھاتے ہیں کہ دیکھو! سامنے جو گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھ رہا ہے اور ہماری عینک کو دھندلا رہا ہے۔ یہ در حقیقت پانی ہے جو بھاپ بن کر اُڑ رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی اُودے اُودے بادلوں سے جا مِلے گا۔ یہ بادل سمندر سے پانی بھر کر ہر سال شمال کو لے جاتے ہیں۔

چو ابر یہاں سے اُٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا

یہ شہر ہمیشہ ترسا ہے یہ شہر ہمیشہ ترسے گا

ساحلی ابخرات کا ذکر آتے ہی ان دو دیہاتی مولویوں کا قصّہ یاد آ گیا جو پہلی دفعہ ہاکس بے کا جیتا جاگتا ساحل دیکھنے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک خاتون سیاہ برقعہ اوڑھے نہا رہی ہیں۔ ان سے ذرا فاصلے پر کچھ نسائی پیکر جھاگ اور دُھند میں اِدھر ڈوبتے ہیں، اُدھر نکلتے ہیں۔ سامنے ایک سفید فام لڑکی دُھوپ میں نہائی ہوئی ریت پر بیٹھی اپنا بدن سنولا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بے بند کی آبی محرم فقط قوتِ ارادی سے کی ہوئی ہے۔ دونوں بزرگ دیر تک خدا کی قدرت کا تماشا دیکھتے رہے۔ ایکا ایکی پہلے مولوی صاحب جو عمر میں بڑے تھے

اور عینک لگاتے تھے گھبرا کر چیخے ”حاجی امام بخش! خدا کے لیے نظریں نیچی کر لو میں تو اندھا ہو گیا ہوں!“

یہاں آب و ہَوا میں آب اور آب میں نمک کی زیادتی کے باعث موسم ہر وقت سِلونا رہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی آب و ہَوا میں تاجر اور مہاجر کے سوا اور کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ سبزہ اور پھل پھُلواری کی نایابی کا اس سے اندازہ کر لیجیے کہ یہاں سبزہ[۳] سے سو روپے کا نوٹ مُراد ہوتا اور تربوز اور گنّے کا شمار پھلوں میں ہوتا ہے۔ اکثر بھلے گھروں میں ریفریجریٹر کو محض صراحی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے چشمِ خود ایک ریفریجریٹر میں مٹی کے پھل رکھے دیکھے ہیں۔ یوں کہنے کو یہاں چار پانچ دریا ضرور ہیں جو کراچی کے نقشے پر سال بھر بہتے رہتے ہیں۔ یہ کراچی کے لیے بڑی نعمت ہیں۔ اس لیے کہ اِن کے پیٹ سے پی ڈبلیو ڈی کے ٹھیکیدار سال بھر بجری نکالتے رہتے ہیں۔

عروس البلاد کے فنِ تعمیر میں ہَوا کا بڑا حصّہ ہے۔ یہاں ہر مکان قبلہ رُو ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مغرب سے تیز ہوائیں چلتی ہیں جو ٹھنڈی ٹھنڈی ریت برساتی رہتی ہیں۔ منہ پر ذرا ہاتھ پھیریئے تو محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی تیمّم کیا ہے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بجری کے ٹھیکیدار رات کو اپنے

[۳] اس زمانے میں سو کے نوٹ کا رنگ گہرا سبز ہوتا تھا۔

خالی ٹرک ''دریائے ملیر'' میں ہوا کے رُخ پر کھڑے کر دیتے ہیں۔ صبح تک وہ خود بخود بجری سے بھر جاتے ہیں، خالی کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ (مصر اگر تحفہ نیل ہے تو کراچی تحفہ ملیر!)، بعض اوقات جب موسم سہانا ہوتا ہے تو یہ پچھوا سارا مزہ کرکرا کر دیتی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اچھے خاصے صحن میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں کہ یکایک

چلی سمتِ ''غرب'' سے اِک ہَوا کہ چمن سرور کا جل گیا

غالباً یہ ساحلی آب و ہوا کا اثر ہے کہ بدلتے ہوئے موسموں کے اس گنجان کاروباری شہر میں مچھلی اور مہمان پہلے ہی دن بدبُو دینے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی جب اُمس بڑھ جاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بندر گاہ ایک وسیع و عریض تُرکی حمّام ہے جس میں سب کپڑے پہن کر ابخراتی غُسل کر رہے ہیں۔ کپڑے ہیں کہ سوکھنے کا نام نہیں لیتے (شاید اسی لیے دھوبی دو دو ہفتے شکل نہیں دکھاتے) پسینہ ہے کہ کسی طرح خشک نہیں ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ بلاٹنگ پیپر کا لباس بنوا لیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی ستر کُشا آب و ہَوا میں کپڑے موسم سے بچاؤ کے لیے نہیں بلکہ صرف قانون سے اپنے کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ عام طور سے فیشن موسم کی رعایت سے بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ

دوسرے شہروں میں اونچے گھرانوں کی فیشن پرست خواتین اہم تقریبوں میں خاص طور سے کپڑے پہن کر جاتی ہیں۔ یہاں اُتار کر جاتی ہیں! لہٰذا رقص کے لباس کی تراش خراش میں قابل درزی اِس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کپڑا کم سے کم رقبۂ بدن ڈھانک سکے۔

شام کو عموماً اتنی اوس پڑتی ہے کہ آپ اوک سے پی سکتے ہیں۔ نائیلون بھیگ کر پیاز کی جھلّی بن جاتا ہے اور رخساروں پر پنسل سے بنی ہوئی بھنوؤں کے ریلے بہنے لگتے ہیں۔ گزشتہ سنیچر ہی کی بات ہے کہ میں ٹہلتا ہوا کلفٹن جا نِکلا۔ دیکھا کہ سمندر کے کنارے ایک میز پر مرزا عبدالودود بیگ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ چائے تو غیر واجبی سی تھی لیکن پڈنگ بے حد مزیدار نِکلی۔ میں نے بیرے سے ہونٹ چاٹتے ہوئے فرمائش کی کہ ایک "سنگل" پلیٹ پُڈنگ اور لاؤ تو اس نے نہایت رُکھائی سے جواب دیا کہ اس ریستوران میں پڈنگ نہیں بنتی۔ لیکن جب میں نے اس کو اپنی پلیٹ پر پڈنگ کے آثار دکھائے تو فوراً لاجواب ہو گیا۔ دوڑا دوڑا گیا اور پلیٹ میں چار بسکٹ اور ایک چمچہ لے آیا۔

اسی بھیگی بھیگی شام کا ذکر ہے کہ ایک سجیلا جوان جو کراچی میں نووارد معلوم ہوتا تھا سینہ تانے سامنے سے گزرا۔ اس کی مونچھیں بقول شخصے دو بجنے میں دس منٹ

بجا رہی تھیں۔ دیر تک میری نگاہیں اس کی سنہری کُلاہ کے کلف دار طرّے پر جمی رہیں جو مور کی مغرور دُم کی مانند پھیلا ہوا اور نئے کرنسی نوٹ کی طرح کرارا تھا۔ دس منٹ بعد وہ ساحل کا چکر لگا کر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ طُرّہ، جی ہاں وہی سرکش طُرّہ، اس کے مُنہ پر دوہاجو کے سہارے کی طرح لٹک رہا ہے اور اس کے پیچھے مونچھیں چار بجنے میں بیس منٹ بجا رہی ہیں۔

برسات کی بہاریں تو آپ دیکھ چکے ہیں اب ذرا سردی کا حال سنئے۔ یہاں کی سلیقہ شعار خواتین کو اپنے گرم کپڑے استعمال کرنے کی خاطر لاہور جانا پڑتا ہے۔ دسمبر میں یہاں ایک چادر کی سردی پڑتی ہے۔ یہ چادر مچھروں سے بچنے کے لیے اوڑھی جاتی ہے۔ البتہ جب اخباروں میں متواتر خبریں آتی ہیں کہ لاہور میں غضب کی سردی پڑ رہی ہے تو باشندگانِ کراچی اخلاقاً اپنے گرم کپڑے نکالتے ہیں، چلغوزے کٹکتے پھرتے ہیں اور انہیں اخباروں سے پنکھا جھلتے ہیں اور چھینک آتے ہی کمبل اوڑھ لیتے ہیں۔ عالم یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی جھوٹوں بھی اُڑا دے کہ لاہور میں اولے پڑے ہیں تو زندہ دالانِ کراچی فوراً سر مُنڈا لیتے ہیں۔

مرزا غالب کے قویٰ مضمحل ہوئے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تندرستی نام ہے عناصر میں اعتدال کا۔ مجھے غالب اور تندرستی دونوں بہت عزیز ہیں لیکن میں

سمجھتا ہوں کہ جہاں تک موسم کا تعلق ہے عناصر کی معتدل آمیزش جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ جیکب آباد کی گرمی، ملتان کی گرد، مری کی سردی اور گوادر کی سیلن کی آمیزش سے جو معتدل مرکّب ظہور میں آئے گا وہ اس شہرِ نگاراں کا موسم ہو گا۔ جذبۂ حُبّ الوطنی کی اس سے مہیب آزمائش اور کیا ہو گی کہ انسان اس موسم کو ہنستے کھیلتے انگیز کر لے اور اس کے دِل میں کبھی یہ خواہش نہ ہو کہ بقیہ عمر طبیعی پہاڑوں میں ناکردہ گناہوں سے توبہ کرنے میں گزار دے۔

کاغذی پیراہن

ساجد: آپ کی ان عُریاں تصویروں میں فن کارانہ ضبط کی کمی ہے گو کہ آپ نے اس کی تلافی اپنے بے باک اسلوب اور اخلاقی جرأت سے کر دی ہے۔

مصوّر: زرّہ نوازی ہے۔

ساجد: ان تصویروں میں آپ نے جنسی جذبے اور تعزیراتِ پاکستان دونوں کو بڑی جی داری سے للکارا ہے۔ یہی نہیں، ان میں چونکا دینے والے معصوم تحیر کی تازگی اور چمک بھی ہے۔۔۔۔ ذہانت کی وہ اچانک چمک جو ایک ایسے غبی لڑکے کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے جس پر پہلے پہل یہ انکشاف ہُوا ہو کہ پشواز کے نیچے سچ مُچ سارنگی کے تار کی طرح تنا ہُوا کٹیلا بدن بھی ہوتا ہے۔

زبیر: (سنجیدگی سے) محرم اور اس کے متعلقات کے خطوط کو اُبھار کر فنکار نے غالباً جنسی گرمی کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

ساجد: مگر اس پینٹنگ سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ فنکار کو لُو لگ گئی۔

زبیر: (قُل اعوذی لہجے میں) حضرت! جہاں تک تحیر کا تعلق ہے۔ ہماری رائے میں عنفوانِ شباب کا ندیدہ پن اور اُبال، اُدھیڑ پن کی اس بے دِلی سے بہر صورت بہتر ہے جو اچھّی صحت اور خراب صحبت کی آمیزش کے بعد جمالیاتی "پیوری ٹیزم" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ساجد: اُبال میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی نکسیر پھُوٹ نِکلی۔

مصوّر: (جل کر) صاحب! سوال یہ نہیں ہے کہ ناچیز نے خون تھوکا ہے یا رال ٹپکائی ہے۔ حقیقت سے آنکھیں چُرائی ہیں یا چار کی ہیں۔ یہ اُبال لا اُبالی کا نتیجہ ہے، یا ہاضمے اور حافظے کی خرابی کا اثر۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ان تاثراتی تصویروں میں جو بقول آپ کے مجھ سے سرزد ہو گئی ہیں، کوئی حُسن ہے یا نہیں۔

ساجد: ہے کیوں نہیں، ارے صاحب! یہی تو کھانڈ کے کھلونوں کی کمزوری ہوتی ہے۔ افراطِ حُسن ہی سے آخر کلاسیکی فن کا دم گھُٹ گیا۔ وہ دن گئے کہ فن کار صرف مہ رُخوں کے لیے مصوّری سیکھتے تھے۔ اب جان دار فن کو حُسن کے سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے برخلاف مَیں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کا سارا زور محض حُسن اور حُسنِ زن پر ہے۔ شخصیت پر نہیں۔

مرزا: بالفاظِ دیگر ساجد صاحب کے نزدیک حُسن فقط اِسم نہیں ہے۔ اس کا تعلّق مسماۃ سے ہے۔

ساجد: اگر سیدھی سادی بات اس گنجلک پیرائے میں آپ کی سمجھ میں آسانی سے آتی ہے تو یونہی سہی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ نِرے حُسن سے کام نہیں چلتا۔ یہ چشمِ بد دُور قسم کی "اومف" لڑکیاں جو ادبدا کر ہر نگاہ کی زد میں آجاتی ہیں، ریگستان کی رات کی مانند خشک اور ٹھنڈی ہیں۔ ان کے جنسی اپیل کی خاطر ادھ کھلے ہونٹ اور نیم وا آنکھیں سُرمے سے بنائے ہوئے ابروؤں کے یکساں خم اور بڑھے ہوئے ناخنوں کی ایک جیسی نوکیں، ایک ہی تراش کی جگ بھاتی اَٹنگی چولیاں اور ان کی ایک سی

مہکار۔۔۔ یہ سب اسٹریم لائن ہو گئی ہیں۔ ان میں وضع داری ہے، طرح داری نہیں۔ مجھے ان میں کوئی شخصیت، کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی۔

مصوّر: مگر انفرادیت پر اِتنا زور کیوں؟ یہ سراسر ایک غیر جمہوری جذبہ ہے، ساجد صاحب! آپ نے پنجابی کا وہ مقولہ سُنا ہو گا۔ ''رَن تے اَن نُوں نندنا نہیں چاہی دا۔'' یعنی کھانے اور عورت میں مین میخ نہیں نکالنا چاہیے۔

ساجد: اس قسم کی جذباتی رتوندی گرہستی زندگی میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے مگر آرٹ سُوجھ بُوجھ چاہتا ہے۔ آرٹسٹ اس قسم کے عقیدے کو دُنبے کی چکّی کی طرح لٹکائے پھرے، یہ آرٹ سے زیادہ عقیدے کی تضحیک ہے۔

زبیر: لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آرٹ کا اصل موضوع کیا ہے؟

مرزا: حقیقت عُرف عورت

ساجد: چلئے، اتمامِ حُجّت کے لیے یہ مان لیتے ہیں۔ لیکن ان تصویروں میں رنگوں کی شوخی سے زیادہ خطوط کے تیکھے پن پر خونِ جگر تلف کیا گیا

ہے۔ اب اس روغنی تصویر ہی کو لیجیے۔ جسم کے پیچ و خم واقعی ایسے ہیں کہ اگر یہ لڑکی موسلا دھار بارش میں کھڑی ہو جائے تو کیا مجال کہ پیروں پر ایک چھینٹا بھی پڑ جائے۔

مرزا: آپ کا اشارہ غالباً نا قابلِ ذکر دائروں اور نظر میں چبھنے والے زاویوں کی طرف ہے۔

مصوّر: نظر خراشی کی معافی چاہتا ہوں۔ اگر بدن کو رندے سے چھیل چھال کر پیش کرنا ہی حسن کاری ہے تو میرا دُور ہی سے سلام۔ رہا رنگوں کی شوخی کا معاملہ، تو گزارش ہے کہ مَیں نے ان میں ٹھیٹ مقامی رنگ بھرا ہے۔ یعنی مٹیالا جو کراچی کا اصلی رنگ ہے۔ اسے میری کم نظری کہ لیجیے مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے حِنائی انگلیاں، صندلی باہیں، دہکتے رُخسار، گلنار لب، چمپئی بدن اور اُن پر اُودی اُودی رگوں کے روایتی جال، نیلگوں آنکھیں اور ان کے مہین مہین گُلابی ڈورے سوائے مغل آرٹ اور اسلامی ناولوں کے کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ کراچی میں درخت ہی ہرے نہیں ہوتے۔ دُھوپ اور دُھول سے ان کا رنگ خاکی ہو جاتا ہے۔ نہیں صاحب! میں شوخ رنگ کے چھینٹوں سے تصویر

کو لال چھپھانے سے قاصر ہُوں۔ پکاسو کے اداس اداس نیلے رنگ۔۔۔۔۔

مرزا: (بات کاٹ کر) سچ تو یہ ہے کہ کراچی میں طبیعت کے سوا کوئی چیز ہری نہیں ہوتی۔

مصوّر: مرزاصاحب! اور کافی لیجیے۔ تھوڑی سی۔

مرزا: شکریہ! آج بہت چڑھا گیا۔ پیٹ میں الغوزے سے بج رہے ہیں۔

ساجد: غالباً میں اپنا مطلب واضح نہیں کر سکا۔ مثال کے طور پر یہ یک رنگ خاکہ ملاحظہ فرمایئے۔ چہرے کے خطوط کس قدر متوازی اور یکساں ہیں۔ بالکل مستطیل معلُوم ہوتا ہے۔

مصوّر: وجہ ظاہر ہے یہ ایک کتابی چہرہ ہے۔

ساجد: کتاب جنسیات کی معلوم ہوتی ہے۔

مصوّر: پھبتی سے آدمی لاجواب ہو جاتا ہے۔ قائل نہیں ہوتا۔ البتہ یکسانیت کے متعلق عرض ہے کہ بد قسمتی سے اس وقت آپ نے ایک ہی ماڈل کی لگاتار چار تصویریں دیکھ ڈالیں۔ آپ خود واقف ہیں کہ یوں تو کراچی

کی شبینہ رقص گاہوں میں سینہ زور بھی ہیں اور چاک دامن بھی مگر

مرزا: تو سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ یہ بی بی پاک دامن کی تصویر ہے!

مصوّر: (نوٹس نہ لیتے ہوئے) مگر وہ سب مصوّر کی نظروں سے اوجھل اور دسترس سے باہر ہیں۔ رہیں متوسّط گھرانوں کی لڑکیاں تو ان کا عالم یہ ہے کہ کوئی اللہ کی بندی بُرقع اوڑھ کر بھی ماڈل بننے کے لیے رضامند نہیں ہوتی۔ صورتِ حال کا اس سے اندازہ لگایئے کہ یہاں کا ایک قابل مگر قلّاچ آرٹسٹ (جو تین دفعہ نمائشوں میں انعام پا چکا ہے) محض عورت کی آواز سننے کے لیے ہر ہفتے فون پر ۰۴ سے وقت معلوم کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اسٹوڈیو اصنام خیالی سے آباد رہتے ہیں۔

مرزا: جبھی تو بے چارے تجریدی مصوّر چیل بوٹے بناتے رہتے ہیں۔

زبیر: غالباً اسی یکسانیت کا نتیجہ ہے کہ بعض تصویروں سے پتہ نہیں چلتا کہ "فوکس" کس حِصّے پر ہے۔ پینٹنگ میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ فن کار نے کیا اُجاگر کیا ہے بلکہ اہلِ نظر یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کیا محذوف ہے۔ ماڈل

لاکھ ہیر اتراش سہی لیکن مصوّر کی منجھی ہوئی نظرِ انتخاب بہت جلد یہ تکلیف دہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ کس حِصّے کو فوکس کیا جائے کیونکہ۔۔۔۔

مرزا: مور کی دُم اس کے مُنہ سے بہتر ہوتی ہے۔

ساجد: معلُوم نہیں آپ کو جان سارجنٹ کا شاہکار "اجنبی خاتون" دیکھنے کا اتّفاق ہُوا یا نہیں۔ ثقہ حلقوں میں اس کے کھُلے ہوئے گریبان پر بڑی لے دے ہُوئی تھی۔ اس کی ساری شخصیت دو دائروں میں نچڑ کر آ گئی ہے۔

مرزا: آئے ہے جُزو میں نظر کُل کا تماشا ہم کو!

ساجد: سنجیدہ بحث میں صوفیانہ اشعار سے پرہیز کیجئے۔

مرزا: میں مصرع واپس لیتا ہوں۔

مصوّر: زاویہ نگاہ کی اہمیت سے کِسی کافر کو انکار ہے۔ لیکن حلقے کی گزشتہ نشست میں آپ نے جس زنانے Torso (دھڑ) کے پرخچے اڑائے تھے اس میں مجھے زاویہ نگاہ کا نقص نظر نہیں آتا۔

ساجد: گستاخی معاف! اس میں نگاہ کم ہے اور زاویے زیادہ! آپ نے محدّب شیشہ سے اپنے ماڈل کو دیکھا ہے۔ مانا کہ اختصار ظرافت اور زنانہ لباس کی جان ہے مگر تکلّف برطرف اس تصویر میں تو سینہ اوچھے کے احسان کی طرح کھُلا ہوا ہے۔

مرزا: ماڈل صرف زیورِ تعلیم سے آراستہ ہے!

زبیر: لیکن اس میں شک نہیں کہ مصوّر سہ جہتی تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

ساجد: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی دزدیدہ نگاہ سے درزی کے فیتے کا کام لیا ہے۔ (جھنجلا کر) اور ذرا ملاحظہ کیجئے یہ دوسری Nude طبق سا مُنہ کھولے، کٹوراسی آنکھوں سے ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہے۔

مصوّر: (آپے سے باہر ہوتے ہوئے) یہ کسیروں کی اصطلاحیں ہیں۔ مصوّری سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہُوں، کیا آپ کو اس میں اور کچھ دِکھائی نہیں دیتا؟

مرزا: آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں۔

زبیر: تناسب واقعی قابلِ داد ہے۔

ساجد: اس سے انکار نہیں کہ ہر چُول ٹھیک ٹھکی ہوئی ہے۔ مگر اس ننگی بُچی تصویر میں کوئی فضا، کوئی پیغام نہیں۔

مرزا: پیغام ویغام تو اپنے پلّے نہیں پڑا۔ اگر ہے تو یقیناً قدِ آدم قِسم کا ہو گا۔ البتہ فضا ضرور ہے۔ جاپانی حمّام کی سی! اور نہیں تو!

ساجد: آپ نے میرے مُنہ کی بات چھین لی۔

مرزا: آداب!

مصوّر: پینٹنگ اور پیغام؟ آخر آپ چھلنی سے بالٹی کا کام کیوں لینا چاہتے ہیں؟

زبیر: (سمجھوتے کے انداز میں) میں اس سلسلہ میں آپ کی توجّہ "فرنارڈ" کی "نہانے والیاں" کوربے کی "گھاٹ پر گوری" اور رینوا کے "غسلِ آفتابی" کی طرف مبذول کراؤں گا۔

ساجد: بجز موضوع کے مجھے کوئی بات مشترک نظر نہیں آتی۔ اس میں جنسی اُمس ہے، غسل کی تازگی نہیں۔ (انداز ایکا ایکی خطیبانہ ہو جاتا ہے) مَیں کہنا یہ چاہتا تھا کہ کوئی شائستہ آدمی، تاوقتیکہ وہ پیشہ ور جاسوس نہ

ہو، خوابگاہ کے روزن پر اپنی بے خواب آنکھ نہیں رکھتا۔ ناقابلِ دید پہلوؤں پر روشنی ڈالنا گندہ ذہنی کی علامت ہے اور گندہ ذہنی اور گندہ دہنی دونوں کا اصل سبب معدے کی خرابی ہے۔پِنڈے کا کساؤ بھرے بھرے بازو، تھل تھلاتی رانیں، کیوپڈ کی کھنچی ہوئی کمانیں۔۔۔۔۔یہی وہ گھِسی گھِسائی کھونٹیاں ہیں، جن پر سیاہ کافی پی پی کر بہکنے والے لذّت پرست انحطاطئے اپنے ادھ کچرے جذبات ٹانگتے چلے آئے ہیں۔ یہی دیکھا بھالا جسم جو اپنی آب کھو کر بھی نہ جانے کیوں ہر بار نیا سا لگتا ہے وہ مینار ہے جس کی بلندیوں سے جدید فن کار دعوتِ نظارہ دیتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے۔۔۔۔

مرزا: کُود جاؤں ساتویں منزل سے آج

آج میں نے زندگی کو پالیا ہے بے نقاب

ساجد: مرزا صاحب! آپ اپنے ذہنی توشہ خانہ سے یہ نوادرات نکالنا بند کریں تو مَیں آگے بڑھوں۔ آپ کو بات بے بات لُقمہ دینے کی بڑی بُری عادت ہے۔

مرزا: مُعافی چاہتا ہوں۔ مجھے بالکل یاد نہیں رہا کہ آپ کو ادب سے دلچسپی نہیں۔

مصوّر: چھوڑیئے اس قصّے کو۔ آپ کو اس سادگی میں پُرکاری نظر نہیں آتی تو مُنہ کا مزہ بدلنے کے لیے یہ واٹر کلر ملاحظہ ہو۔ یہ ایک سِن سے اتری ہُوئی خوش باش عورت کی تصویر ہے جس کو مَیں نے جِم خانہ میں تنہا بئیر پیتے دیکھا تھا۔ مَیں نے اس سے وقت پُوچھا۔ جواب میں اس نے فون نمبر بتایا جو مَیں نے نوٹ کر لیا۔

ساجد: تکنیک کے لحاظ سے یہ پچھلی تصویر کی اُلٹ ہے۔ آپ نے رخساروں کی جھُریوں پر بڑی محنت اور محبّت سے استری کی ہے مگر آنکھوں کے کویوں پر مہین مہین لکیریں چُغلی کھا رہی ہیں کہ وقت کی مکڑی دبے پاؤں جالا بُن کر اس کا سارا رُوپ کھا گئی۔

مرزا: دھانے کے دونوں طرف بریکٹ بھی تو لگے ہُوئے ہیں۔

ساجد: اس میں آپ نے خطوط کے بوجھل پھیلاؤ اور نیم گرم رنگوں کے استعمال سے وہ سڈول پن اور گُداز بھی واضح کر دیا جو ادھیڑ عمر کا پیش

خیمہ ہے۔ اُتار چڑھاؤ صاف کہہ رہا ہے کہ پہلے جہاں نشیب تھا وہاں اب فراز ہے۔

مرزا: اور جہاں پہلے خروش تھا، اب وہاں فقط خراش اور اس شِکم بالائے شِکم پر ملاحظہ ہو۔۔۔ وہ اک دہن کہ بظاہر دہانے سے کم ہے۔

ساجد: جی ہاں! خوبصورت تو کسی طرف سے نہیں معلوم ہوتی۔

مصوّر: میں نے کب یہ دعویٰ کیا کہ اس کے پونے دو سو پونڈ میں ایڑی چوٹی تک کوٹ کوٹ کر موہنی بھری ہے۔

ساجد: شاید آپ نے جان بُوجھ کر یہ متورّم کیفیت پیدا کی ہے۔ مُنہ کچھ بھر بھرایا ہُوا سا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آؤٹ آف فوکس فوٹو!

مصوّر: ایک خاص عُمر کے بعد ہر عورت آؤٹ آف فوکس معلوم ہوتی ہے۔ جناب!

ساجد: عُمر کِس کی؟ اپنی یا۔۔۔؟

زبیر: آپ نے غور کیا؟ اس تصویر کا بے تکلّف اسلوب اور گداز، ریمراں کی برہنہ "شیبا" اور ططیان کی عُریاں "وینس اور موسیقار" سے کِس قدر مِلتا جلتا ہے۔

ساجد: بس اتنا فرق ہے کہ یہاں مصوّر نے کپڑے پہنا کر مشرب بہ اسلام کر دیا ہے۔

مرزا: لیلئ معنی وہاں بے پردہ، یا محمل میں ہے۔

زبیر: آپ کو بے پردگی پر اعتراض ہے یا محمل پر؟

ساجد: جی نہیں! میرا اعتراض یہ ہے کہ محمل خالی ہے۔

مرزا: اور ہمیں سِرے سے اُونٹ کی سواری پر اعتراض ہے۔

مصوّر: مَیں پوچھ سکتا ہوں کہ اِن باتوں کا اِس تصویر سے کیا تعلق ہے؟

ساجد: یہ مرزا صاحب سے پوچھئے جنہوں نے چنگاری چھوڑی ہے۔ مجھے جو بات اس تصویر میں کھَلتی ہے۔ وہ اس کی مرصّع کاری اور آرائش ہے۔ دیکھئے تو! بالکل چوتھی کی دُلہن معلوم ہوتی ہے یہ عورت! بناؤ سنگھار ہر عورت کا حق ہے بشرطیکہ وُہ اسے فرض نہ سمجھ لے۔ لیکن۔۔۔

مرزا:　بوڑھی گھوڑی لال لگام!

مصوّر:　(جل کر) اس سے زیادہ قابلِ اعتراض وہ گھوڑی ہے جو بوڑھی بھی ہو اور بے لگام بھی۔

زبیر:　گولی ماریئے دونوں گھوڑیوں کو! اِدھر دیکھئے یہ اِیزل پر رکھی ہُوئی سڈول پنڈلی والی رقاصہ کی تصویر خاصی خیال انگیز ہے۔

ساجد:　اس میں بھی ہِر پھِر کے وُہی لڑکی کی ایک ٹانگ ہے۔

مرزا:　(سرد آہ بھر کر) کاش کنکھجورے کی طرح اس کی ہزار ٹانگیں ہوتیں اور یہ شیس آسن کرتی ہُوئی درّانہ نِکل جاتی۔

ساجد:　بخدا مجھے تعداد پر کوئی اعتراض نہیں۔

مرزا:　واللہ! کانٹا تول چیز ہے۔

مصوّر:　یہ مصر کی ایک نوخیز رقاصہ کی تصویر ہے جو پچھلے ہفتے ایک طائفے کے ساتھ کراچی آئی تھی۔ بس آدھ گھنٹے کی ایک نشست اسی ہوٹل میں رہی جو رُوح اور جیب کی گہرائیوں میں اُتر گئی۔

ساجد: میں نے بھی سنیچر کی رات کو "کیلپ سو" کی تیز تال پر اس کا ناچ دیکھا تھا۔ فن براہِ تن کا اس سے بہتر مظاہرہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔

زبیر: توبہ توبہ! اس قدر حیاسوز نظارہ تھا کہ کسی کا آنکھ جھپکانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

مرزا: ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ۔

ساجد: میں نہیں کہہ سکتا کہ کلاکار کے لیے گھونگھٹ کِس حد تک غیر ضروری ہے۔ لیکن۔۔۔۔

مرزا: یہ گھونگھٹ کے سائز پر منحصر ہے۔

ساجد: لیکن ناموسِ فن کا مدار اسی پر ہے اور یہی سبب ہے کہ اس تصویر میں رمزیت کی کمی شدت سے محسُوس ہوتی ہے۔ اس میں مونالزا کی مسکراہٹ کی طرح سوچ میں ڈالنے والی کوئی بات نہیں۔ مصوّر نے اپنا مُدعا اُردُو اخباروں کی جلی سُرخیوں کے مانند نہایت واضح اور غیر مبہم طریقے سے ظاہر کر دیا ہے۔ آپ کو وہ مقولہ یاد ہو گا کہ شائستہ آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ میرلن منرو کے سراپا کی گولائیوں کو ہاتھ ہلائے بغیر بیان کر سکے۔

مصوّر: بندہ پرور! یہ سرد و گرم چشیدہ جسم کے تاثراتی مطالعے ہیں۔ ان پر میڈونا جیسے معصوم چہروں کی قلم نہیں لگ سکتی۔ اگر آپ چینی کی گڑیوں جیسے چہرے دیکھنا چاہتے ہیں جن کے لذت ناآشنا ہونٹوں سے چھَٹی کے دُودھ کی بُو آتی ہو، تو ان تصویروں سے آنکھیں پھیر لیجیے۔ مَیں اپنے سر پر ہے کوہِ قاف لادنے سے معذور ہوں۔ اَب سے پچاس سال پہلے رومانی فن کار اور نفاست پسند حضرات حقیقت المعروف بہ عورت میں وہی خُوبی تلاش کرتے تھے جو فی زمانہ صرف ''کوکاکولا'' اور ''اوولٹین'' میں پائی جاتی ہے۔ یعنی کسی انسانی ہاتھ نے نہ چھُوا ہو۔ ایشیا نے انسانی جسم کو ہمیشہ ایک مقدس امانت سمجھا اور مادی آلائشوں سے بلند رکھا۔

مرزا: آسائشوں سے بُلند رکھا کہیئے۔

مصوّر: لہٰذا ہماری تہذیب میں اس کا صحیح مقام اور منصب صلیب ہے نہ کہ سیج۔

ساجد: مجھے خوشی ہے کہ آپ نے غصّے میں دو چار ریڈی میڈ فقرے داغ دیئے۔

مرزا: اس لحاظ سے آپ نے بھی آج آموختہ بُرا نہیں سنایا، ساجد صاحب!

مصوّر: آپ نے پڑھا ہو گا اور پڑھا نہیں تو سُنا ضرور ہو گا کہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں پیانو، میز اور کُرسی کے پایوں پر ڈھیلے ڈھالے دبیز غلاف چڑھائے جاتے تھے۔ کیونکہ شرفاء ننگے پایوں کو نگاہ بھر کے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور تو اور محفل میں ”رومال“ کا لفظ زبان پر لانا بدتمیزی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ حالانکہ حاضرین کو ایک دُوسرے کی ناک یا اس کے بہنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہمارے ہاں اب بھی عصمت چغتائی کے ”لحاف“ سے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں اور شریف بہو بیٹیاں منٹو کے افسانے پانچویں چھٹی دفعہ پڑھتے وقت بھی شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہیں۔

ساجد: شرم وحیا عورت کا زیور ہے۔

مرزا: غالباً اسی لیے آج کل صرف خاص خاص موقعوں پر پہنا جاتا ہے۔

مصوّر: آخر آپ کو جسم پر کیا اعتراض ہے؟

ساجد: جسم پر اعتراض صرف روحوں کو ہو سکتا ہے۔ مجھ سے پوچھیے تو بیسویں صدی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جسم کے تقدس اور

تقاضوں کو مانا اور منوایا۔ لیکن مجھے جسم کی غیر فنّی نمائش پر ہمیشہ اعتراض رہا ہے۔ اس قسم کے فن کا بڑا عبرتناک انجام ہو گا۔

مرزا: یعنی یہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر لیا جائے گا؟

زبیر: بہر حال ساجد صاحب کی یہ رائے میں ہے کہ عریانی فن کے لیے مُضر ہے۔

ساجد: ممکن ہے یہ صحیح ہو، مگر یہ رائے میری نہیں ہے! دراصل عُریانی کے لیے فن سب سے بڑا خطرہ ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ مکمل عُریانی سے کہیں زیادہ خطرناک اور مخرّبِ اخلاق وہ نیمے دروں نے بروں قسم کی ستر پوشی ہے جو زوال آمادہ تخیل کو اُکساتی ہے۔ ایپسٹائن کے مجسمے کو دیکھ کر میرے بدن میں چیونٹیاں سی نہیں رینگتیں، لیکن اگر انہیں نائیلون کے برقعے پہنا دیئے جائیں تو میں فحش قرار دوں گا۔

مرزا: گویا الف ننگا ننگ تن، نیم برہنہ خطرۂ فن!

ساجد: یاد کرو ہجّے اور معنی!

زبیر:　(ہنس کر) گرم ممالک میں بغیر ردیف قافیے کے بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔

مصوّر:　اگر میں غلط نہیں سمجھا تو آپ عُریانی کو اتنا معیوب نہیں سمجھتے جتنا انجیر کے پتّے کو!

ساجد:　درست! انجیر کا پتّا بلیغ علامت ہے نہ صرف احساسِ گناہ کی بلکہ ترغیبِ گناہ بھی ہے۔

زبیر:　اور اعلانِ گناہ بھی!

مرزا:　جن پر تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے۔

زبیر:　آج کی بحث سے ہم اس خوشگوار نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ فن کا مقصد وہی ہے جو ایشیائی لباس کا۔۔۔۔ یعنی جسم کی خوبیوں کو چھپانا اور خامیوں کو اُبھارتا۔ اس نقطہ نگاہ سے عُریانی غیر فنّی بھی ہے اور غیر مفید بھی۔

ساجد:　میں صرف غیر فنّی کہنے پر اکتفا کروں گا۔ اس لیے کہ عُریانی کا افادی پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دن دُور نہیں جب عُریانی جو اب تک

خاصے کی چیز تصوّر کی جاتی ہے۔ رفاہِ عام کی خاطر جائز قرار دے دی جائے۔ اس صورت میں عُریاں تصاویر لاعلاج جنس زدہ لوگوں کے "علاج قوّتِ ضعفِ نظارہ" کے لیے نسخے میں لکھی جائیں گی۔ فحش کتابوں کی تصنیف واشاعت کے لیے ہر حکومت کی طرف سے مالی امداد ملے گی۔ اس قبیل کی مقوّی بصر تصویریں ہر شفاخانے کی آرٹ گیلری میں لگائی جائیں گی اور مجسمے میوزیم میں رکھے جائیں گے۔ ضرورت مندوں کو نفسیاتی معائنے کے بعد داخلے کے پاس ملیں گے۔

مرزا: مگر شاعروں کو بغیر معائنے کے اندر آنے کی اجازت ہو گی۔

ساجد: دیکھنے والوں کی اکثریت سٹھیائے ہوئے سیٹھوں کی ہو گی جو اپنی عمر کو انکم ٹیکس کی طرح چھپاتے ہیں۔ یا ان از کار رفتہ بزرگوں کی جن کی کیفیت اِن ضدّی بچّوں جیسی ہوتی ہے جن کا ابھی ابھی دُودھ چھُڑایا ہو۔

مرزا: واقعی، جہاں جنسی محرومی اتنی عام ہو کہ دہانے دہانے پر مُہر لگی ہو، جہاں لوگ اصل سے کچیاتے اور عکسی پر جان دیتے ہوں، وہاں ان

تصویروں کی افادی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان حالات میں تو فی الواقع

عیدِ نظّارہ ہے تصویر کا عُریاں ہونا

ساجد: جی ہاں! شکست خوردہ روح کی آخری پناہ گاہ جسم ہی تو ہے۔ زوالِ آدم سے لے کر اس وقت تک واماندگی شوق یہ پناہیں تراشتی رہی ہے۔ اس بڑھتی ہوئی سماجی ضرورت کے احساس نے جدید فن کار کو مجبور کر دیا کہ وہ وسیلۂ اظہار کو وسیلۂ معاش کے طور پر برتے۔

مرزا: اور سچ پوچھئے تو یہی اصل وجہ ہے اس کی خواری کی۔ بقول میر:

صناع ہیں سب خوار، ازاں جُملہ ہُوں میں بھی

ہے عیب بڑا اس میں سے کُچھ ہنر آوے

ساجد: میر کی بھی بھلی چلائی۔ اس ظالم کے بہتّر نشتروں سے صحت مند شاعری کو اتنا ہی نقصان پہنچا جتنا بہتّر فرقوں سے اسلام کو۔

زبیر: بہر حال، مصوّر اس لحاظ سے قابلِ مبارکباد ہے کہ ان بولتی ہوئی تصویروں میں ناآسودہ تقاضوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ساجد: مَیں آپ سے متّفق ہُوں۔ مصوّر نے ایک غلط منزل کی طرف صحیح قدم اٹھایا ہے اور یہ ہمارے ملک کی اس عام روش سے بدرجہا بہتر ہے کہ صحیح منزل کی جانب غلط قدم اٹھایا جائے۔

زبیر: آپ کی زبان سے امان پاؤں تو کچھ عرض کروں (وقفہ) بڑے فن میں کوئی سمت نہیں ہوتی۔

مرزا: گستاخی معاف! "بڑے اور چھوٹے" کی اصطلاح غیر فنّی ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسے پیشے سے ہے جس میں مو قلم کی بجائے ایک دھار دار آلہ استعمال ہوتا ہے۔

ساجد: عجیب بات ہے کہ جب فن میں چار پیسے کمانے کی صورت نکل آئے تو لوگ اسے پیشہ کہنے لگتے ہیں۔ ہمارے ہاں فکر و فاقہ فن کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

زبیر: کچھ بھی ہو ہم مصوّر کی شدّتِ احساس اور خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ساجد: یہاں خالی خولی خلوص سے کام نہیں چلنے کا۔ بچھو بڑے خلوص سے ڈنک مارتا ہے اور بکری انتہائی خلوص سے ممیاتی ہے لیکن ہم اسے فن نہیں

کہہ سکتے۔ یہ نہ بھولیے کہ فن کو جتنا نقصان خلوص کے برملا اظہار سے پہنچا ہے اتنا سرکاری سرپرستی سے بھی نہیں پہنچا۔ میں خلوص کا کھُلے ڈلے پیرائے میں اظہار صرف دُعا اور قرض مانگتے وقت جائز سمجھتا ہوں۔ فن ضبط اور ٹھہراؤ کا متقاضی ہے۔ فن ریاض چاہتا ہے۔ فقط دِل سے چیر کر دکھانا کافی نہیں۔

مرزا: ہمارے فن کار بہت سہل انکار ہیں۔ پسینے کی جگہ محض اپنا خون بہا کر کام نکالنا چاہتے ہیں۔

ختم شد